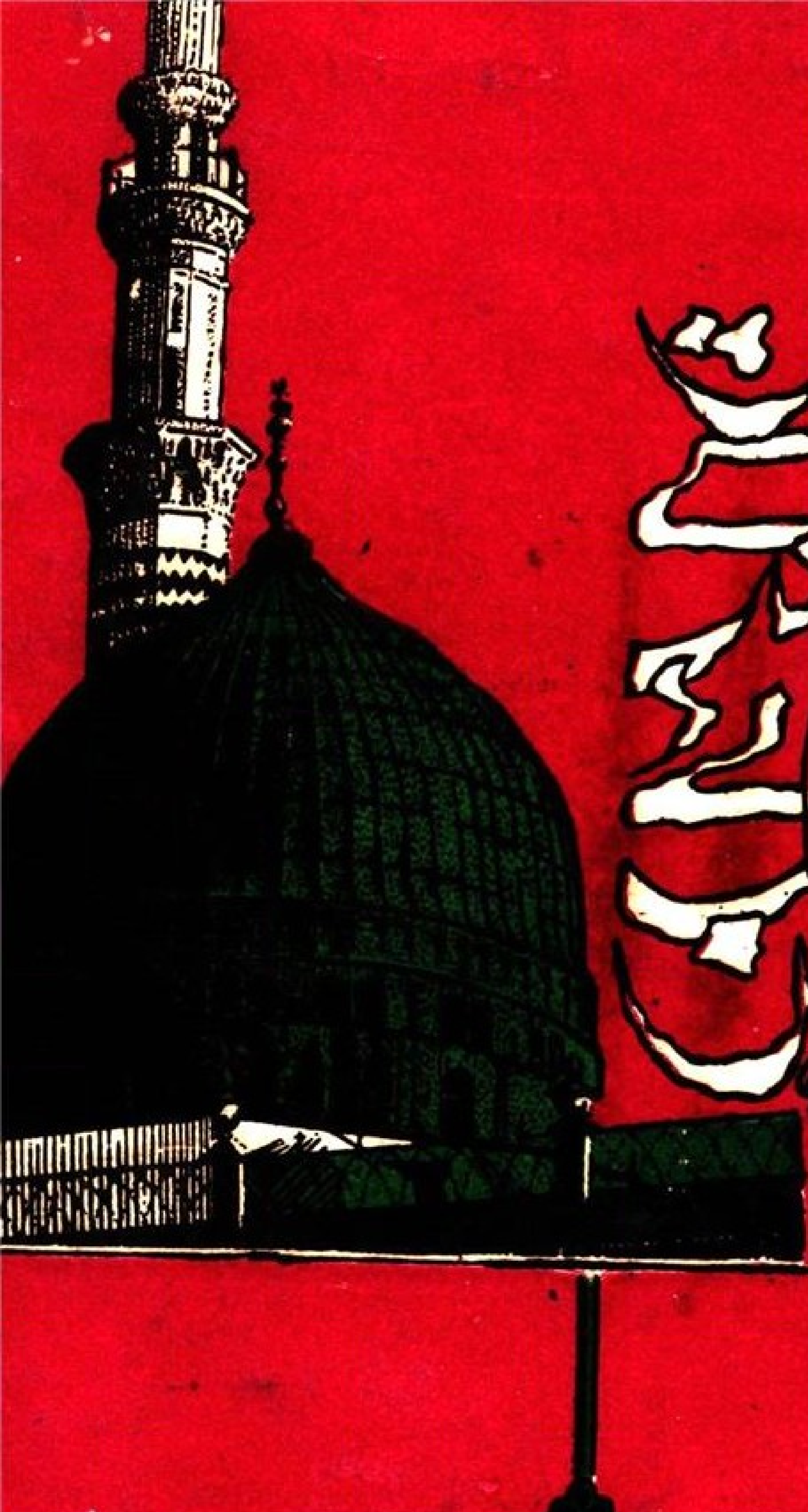


نعت کے چند شعرائے متقدمین

ڈاکٹر سید شمیم گوہر

بسمہٖ تعالیٰ

نعت

کے چند

شعرائے متقدمین

مصنفہ

ڈاکٹر سید شمیم گوہر

ملنے کا پتہ

سید ابوطاہر

خانقاہ حلیمیہ ابوالعلائیہ۔ ۱۲۷۔ چک، نیا حجرہ۔ الہ آباد

127 - CHAK NAYA HUJRA

Allahabad

PRINTED AT - ADHUNIK OFFSET NAINI

بہ اہتمام و تعاون

شری سنجے کمار اگروال بلّو

شریک کار ______ غلام سرور گارڈ

تاریخ اشاعت ______ اکتوبر ۱۹۸۹ء

تعداد ______ ایک ہزار

قیمت ______ ۲۰ روپیے

کتابت ______ قربان علی

مطبع ______

انتساب

میں اپنی اس تصنیف کو

اپنے دادا سید الاساتذہ حضرت علامہ مولانا سید شاہ عبد الرشید عظیم آبادی

اور

اپنے نانا سید المشائخ حضرت علامہ سید شاہ عبد الحلیم اکبری ابو العلائی قدس سرھما

کی بارگاہ میں

نذر کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں

جن کی یادیں

میرے جذبۂ ایمانی کو تقویت پہونچاتی رہتی ہیں

فہرست

اردو کی نعتیہ شاعری سے اقتباس

فرمان فتحپوری کراچی

تاریخی حیثیت سے اردو میں نعت گوئی کی روایت نئی نہیں بہت پرانی ہے۔ اتنی ہی پرانی جتنی خود اردو شاعری ہے۔ قدیم دکنی شعرا سے لیکر آج تک اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے خاص شغف اور لگاؤ کے ساتھ کہے ہوں کسی نے محض تکلفات سے کام لیا ہے۔ کسی نے تواتر اور اہتمام سے اس کام کو انجام دیا ہے اور کسی نے گاہے گاہے طبع آزمائی کی ہے۔ کسی نے ــــ طویل نعتیہ قصیدے اور مثنویاں لکھی ہیں، کسی نے مختصر نعتیہ غزلیں اور رباعیات کہی ہیں۔ کسی نے سیرت اور شخصیت کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ کسی نے معجزات و غزوات کو شعر کا موضوع بنایا ہے، کسی نے نعتیہ شاعری کے پورے پورے دیوان یادگار چھوڑے ہیں اور کسی کے یہاں اکا دکا نعتیہ غزلیں نظر آتی ہیں، کچھ نے اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ اور کچھ اوسط وادنیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکے لیکن دو چار شعر قریب قریب ہر ایک نے کہے ہیں۔ مسلسل نہ سہی متفرق اشعار کی صورت میں۔" ان حالات میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کی چار سو سالہ تاریخ میں نعتوں کا کتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہوگا۔ یہ مانا کہ اس ذخیرے کا زیادہ حصہ بعض دوسرے موضوعات کی شاعری کی طرح معمولی درجے کا ہے لیکن ایک حصہ ضرور ایسا

ہے جو فکر و فن کے معیاروں پر پورا اترتا ہے اور بلند پایہ شاعری کے زمرے میں آتا ہے لیکن کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ اس ذخیرے کو اب تک کسی نے قابل اعتنا نہیں جانا۔ اردو شاعری کی دوسری اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ کے بارے میں بے شمار قیمتی مقالات لکھے گئے ہیں اور سیکڑوں تحقیقی و تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن نعت گوئی پر چند متفرق مضامین کے سوا کوئی مختصر سی کتاب بھی نظر نہیں آتی۔ اسکے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ نعت گوئی صنف سخن نہیں ہے اس کی کوئی ہیئت متعین نہیں ہے بلکہ مختلف ہیئتوں میں اس کے موضوع کو برتا گیا ہے، اور اسی لئے صنف سخن کی حیثیت سے اس پر کام کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ جواب شافی نہیں ہے زندگی اور شعر و ادب کے سیکڑوں ایسے پہلو ہیں جو اصناف شعر کے زمرے میں نہیں آتے پھر بھی ہمارے محققین و ناقدین نے ان پر خاطر خواہ توجہ دی ہے مثال کے طور پر "طنز و مزاح اور مرثیہ" کو لے لیجئے ہیئت کی پابندی ان میں بھی نہیں ہے کسی ہیئت میں بھی مزاحیہ نظم اور مرثیہ کہا جا سکتا ہے اس لحاظ سے یہ بھی اصناف سخن سے خارج ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ ان دونوں موضوعات پر اردو میں خاصا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن نعت گوئی پر اب تک کسی طرح کا کوئی قابل ذکر کام منظر عام پر نہیں آیا۔

نعت ایک صنف سخن کی حیثیت سے

نعت عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنیٰ تعریف یا وصف بیان کرنے کے ہیں مثلاً فارسی کے اس شعر میں ؎

جاوید ہمی باش بہ ایں نعت بایں وصف
پاکیزہ باخلاق و پسندیدہ بافعال

نعت کا لفظ اپنے لغوی معنی ہی میں استعمال ہوا ہے لیکن ادبیات اور اصطلاحات شاعری میں نعت کا لفظ اپنے مخصوص معنی رکھتا ہے یعنی اس سے صرف آنحضرت کی مدح مراد لی جاتی ہے اگر آنحضرت کے سوا کسی دوسرے بزرگ یا صحابی و امام کی تعریف بیان کی جائے تو اسے منقبت کہیں گے۔ آنحضرت کی مدح چونکہ نثر میں بھی ہو سکتی ہے اس لئے اصولاً آنحضرت کی مدح سے متعلق نثر اور نظم کے ہر ٹکڑے کو نعت کہا جائے گا لیکن اردو فارسی میں جب نعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے عام طور پر آنحضرت کی منظوم مدح مراد لی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا معنی کی روشنی میں " نعت کا لفظ شاعری کی کسی ہیئت کی طرف نہیں بلکہ موضوع کی جانب اشارہ کرتا ہے یعنی شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ یا مسدس و مخمس وغیرہ میں سے کسی بھی ہیئت میں نعت کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے موضوع سے انحراف یا تجاوز نہیں کیا جا سکتا نعت کا موضوع بظاہر بہت مختصر نظر آتا ہے اس لئے کہ اس کی حدیں حضور کی زندگی اور سیرت سے آگے نہیں بڑھتیں لیکن غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ نعت کا موضوع حقیقتاً ایک انتہائی عظیم اور وسیع موضوع ہے۔ عظیم اس لئے کہ اس کا تعلق دنیا کی عظیم ترین شخصیت اور محسن انسانیت سے ہے وہ کسی خاص قوم یا گروہ کے لئے نہیں بلکہ ساری اقوام کے لئے رحمت بن کر آیا تھا اور خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جگہ جگہ اس کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

جہاں تک موضوع کی وسعت کا تعلق ہے اس میں آنحضرت کی زندگی اور سیرت کے توسط سے انسانی زندگی کے سارے ثقافتی و تہذیبی پہلو اور سیاسی و سماجی مباحث در آئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو فارسی کے بیشتر شعراء نے عموماً حضور اکرم کے حلیۂ اقدس، واقعۂ معراج اور معجزات ہی کو اپنی توجہ کا

مرکز بنایا ہے لیکن نعت کے موضوع کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے اس میں شمائل و فضائل کے ساتھ ساتھ معمولات نبوی، غزوات نبوی، عبادات نبوی آداب مجالس نبوی، پیغامات نبوی اور اخلاق نبوی کے بے شمار پہلو شامل ہیں ۔ حسن عمل، حسن سلوک، حسن خیال، حسن بیان اور حسن معاملہ سے لے کر عدل و انصاف، جود و سخا، ایثار و احسان، سادگی و بے تکلفی، شرم و حیا، شجاعت و دیانت عزم و استقلال، مساوات و تواضع، مہمان نوازی و ایفائے وعدہ زہد و قناعت، عفو و حلم، رحم و مروت، شفقت و محبت، عبادت و تعزیت رقیق القلبی و جاں گدازی، رحمت و مکرمت، لطف طبع و لطف سخن اور انسانی ہمدردی و غمخواری تک تمدنی زندگی کا کون سا پہلو اور کون سا رُخ ہے جس کی ترغیب و ترویج و تزئین و تطہیر کا سامان نعت کے موضوع کے اندر موجود نہیں ۔ حق بات یہ ہے کہ عظمت انسانی کے جتنے گیت آج تک گائے گئے ہیں اور ایک عظیم انسان کے بارے میں جتنے تصورات آج تک قائم کئے گئے ہیں وہ آنحضرت کی رحمتہ اللعالمینی کے ایک ادنیٰ جز کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

آگے لکھتے ہیں ۔

کسی نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ شاعری کے لئے موضوعات کی کمی نہیں ہے کائنات کا ذرہ ذرہ شعر میں ڈھلنے کے لئے بیتاب ہے ضرورت صرف ایک ایسے صاحب نظر فن کار کی ہے جو انھیں شعر کا قالب عطا کر سکے حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں موضوعات کے انتخاب کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ موضوع کے بے جان جسم میں روح ڈالنے کا ۔

(اردو کی نعتیہ شاعری مطبوعہ کراچی ۱۹۷۴ء)

نوائے آغاز

بجانب مصنف

عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے نعتیہ شاعری کا آغاز ہوا اور بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے آج آفاقی عظمت کی حامل بن گئی۔ نعتیہ ادب کی خوشبو قیامت تک مہکتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "ورفعنا لک ذکرک"۔ "اے نبی ہم نے تمہارے لئے تمہارے ذکر کو بلند کیا"۔ منظوم مدح و ثنا کا یہ فریضہ ہر دور میں آگے بڑھتا رہا اور سرزمین عرب سے نکل کر ساری دنیا پر چھاتا چلا گیا۔ نعت شاعری کی وہ صنف ہے جس سے عشق و محبت اور سرمایۂ ایمان وابستہ ہے جس سے فکر و فن کی سچی قدریں وابستہ ہیں اس پر موسم خزاں اور آتی جاتی لہروں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی قسمت لازوال ہے اس کے سامنے نہ جانے کتنے اصناف سخن اپنے سفر پر گامزن ہوئے اور اپنے مزاج و مزاق کو فروغ دیتے ہوئے کچھ فصلی نقوش چھوڑ کر کنارے بیٹھ گئے۔ اک صرف فن مرثیہ کے علاوہ طلسماتی جمالیاتی اور رومانی قصیدہ و مثنوی کے فروغ و ارتقاء کی کیا صورت حال رہ گئی اور پرانے چراغوں سے کتنے نئے چراغ جلائے جا سکے یہ حقیقت اصحاب علم و دانش سے پوشیدہ نہیں بلکہ رفتار ارتقاء ایسی رخصت ہوئی کہ قدیمی کا وشوں کے معیار میں اضافہ کرنے کا ادبی ذوق تک مردہ ہو گیا۔ وہ اردو نعتیہ شاعری جس کا فروغ و ارتقاء ہر ہیئت میں ہوتا ہے ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ صدقہ ہے اس مبارک صنف کا جس نے تمام صنفوں کو ہمیشہ آباد رکھا اور جس نے تمام صنفوں کی آبرو بچائی نعتیہ شاعری کے اس مخصوص

خدماتی پس منظر کا جائزہ لیجئے تو اس کے احسانات کا شمار کرنا مشکل ہو جائے گا۔
نعت کا موضوع بظاہر بہت مختصر معلوم ہوتا ہے مگر اس کے حقائق و محاسن کے کسی بھی سرے تک پہنچنے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ جب رسول کے سایہ میں فکر و فن اور تلاش و جستجو کا عظیم الشان سرمایہ جمع ہوتا رہا مگر صرف موضوعاتی شاعری سمجھ کر اصحابِ علم و دانش کے ایک بڑے طبقے نے اس کے فکر و فن، اس کی گہرائی اس کی صنعت گری اور اس کی حسن آفرینی سے ہمیشہ بے اعتنائی برتی اگر اس کی فکری و فنی عظمتوں کی طرف شروع سے توجہ دی جاتی تو دیگر اصنافِ سخن کی طرح صنفِ نعت کو بھی مرکزیت حاصل رہی ہوتی بیسویں صدی میں نعت پر سب سے زیادہ کام ہوئے اور برائے پی۔ ایچ۔ ڈی متعدد طویل مقالے بھی سامنے آئے مگر ان کی حیثیت ایک سرسری جائزے کے سوا اور کچھ نہیں۔ بار بار صرف تاریخ مدح و نعت مرتب کرنے اور اندازی تبصرے سے تحقیقی امور کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ضرورت ہے ہر عظیم و معیاری نعت گو شاعر کے حالات و کلام سے متعلق انفرادی طور پر تحقیقی کام کرنے کی جیسا کہ میرؔ، ذوقؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، غالبؔ، حالیؔ، مومنؔ، انیسؔ، اقبالؔ اور اکبرؔ وغیرہم پر کام ہوتا رہا ہے چنانچہ اسی نقطۂ نظر اور فریضے کے احترام میں میں نے نو انتہائی اہم اور مسلم الثبوت نعت گو شعراء کی شخصیت، حالات اور کلام سے متعلق مختصر تحقیقی امور کی کوشش کی ہے تاکہ ان کے عظیم الشان ادبی کارناموں کی طرف خصوصیت سے سب کی توجہ مبذول کرائی جا سکے۔ ان نو۹ شعراء کے پیش نظر ممکن ہے یہ بات بھی سامنے لائی جائے کہ "اس عہد کے فلاں شاعر کو چھوڑ دیا گیا اور فلاں ہمعصر شاعر کو نظر انداز کر دیا گیا" نعت گو شعراء کی ایک مخصوص جماعت ہر دور میں آباد رہی مگر مجھے چونکہ صرف انتخاب سے کام لینا تھا

اس لئے یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اپنے اپنے عہد میں ان نو شعراء کی حیثیت سنگ میل کی سی ہے اپنے عہد اور اپنے ہمعصروں میں ممتاز رہے ان کی شعری و فنی انفرادیت مسلم ہے اسی طرح ہند و نعت گو شعراء کی صف میں سرکشن پرشاد شاد کی حیثیت پہلے بھی ممتاز تھی اور آج بھی ہے۔

عرض ہے کہ اس کتاب کا بنیادی موضوع چونکہ نعتیہ غزلوں سے متعلق ہے اس لئے نمونۂ کلام کے طور پر صرف غزلیں پیش کی گئی ہیں البتہ کرامت و محسن کی غزلوں کے علاوہ محض شہرت و عظمت کے زیر اثر ان کا ایک ایک قصیدہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

میرے پرانے محب و مکرم حضرت ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی لکچرر یونانی طبیہ کالج نئی دہلی نے اس کتاب پر نظر اصلاح ڈال کر راقم کو ممنون فرمایا۔

کتاب کے چند مضامین کچھ تحقیقی کمی کے ساتھ رسائل میں پہلے شائع ہو چکے ہیں جنہیں مزید مستحکم کرنے کے بعد دوبارہ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے پھر بھی قارئین اغلاط و عیوب یا سہو نظر کی نشاندہی کر سکیں تو میں ان کا ممنون ہوں گا مطلع کرنے کی زحمت فرمائیں ویسے یہ تصنیف قرآن احادیث کی عبارتوں کا کوئی مجموعہ نہیں جس پر صرف امنا و صدقنا ہی کہا جائے بلکہ یہ حقیر و ناچیز کی ادنیٰ سی کوشش ہے مجھے یقین ہے کہ اصحاب عقل و دانش اس نوعیت کی پہلی کوشش کو ضرور سراہیں گے، نوازیں گے اور وہ ـــ افراد جو نوازنے سے زیادہ تنقیص و عیب جوئی کے متمنی رہتے ہیں میں ان کی بھی دعاؤں کا طالب ہوں۔

سید شمیم گوہر
۲۹ / اگست ۱۹۸۹ء

نعتیہ شاعری کی ابتدا و ارتقاء

سید شمیم گوہر

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو چیز خلق فرمائی وہ اپنے نور سے اپنے پیارے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور خلق فرمایا اللہ کے رسول ارشاد فرماتے ہیں اول ماخلق اللہ نوری "اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کی تخلیق فرمائی" اور پھر اللہ ہی نے سب سے پہلے آپ کی مدح و ثنا فرمائی پورا قرآن حکیم نثری زبان میں مدح و ثنا اور اوصاف و محاسن کا لافانی مجموعہ ہے مگر جہاں تک شاعری کی زبان میں مدح و نعت کا تعلق ہے بعثت رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ایک ہزار سال قبل شاید سب سے پہلی بار تبع حمیری بادشاہ یمن نے نعتیہ شاعری کی ابتدا کی اور اس شاعری کی بنیاد رکھی۔ کتب تواریخ میں منقول ہے کہ بعثت رسالت مآب سے ایک ہزار سال قبل تبع بادشاہ یمن ممالک مشرقیہ کی فتح کے لئے نکلا تو اس کا گذر مدینہ منورہ سے بھی ہوا وہ اپنے بیٹے کو مدینہ میں اپنا خلیفہ مقرر کر کے خود شام و عراق کی طرف روانہ ہو گیا بادشاہ کی روانگی کے بعد لوگوں نے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا بادشاہ کو خبر ملی تو وہ انتقام لینے کے لئے فوراً پلٹا اور قتل عام کا حکم دیدیا۔ علمائے یہود کہنے لگے "تمھیں معلوم ہے یہ پیغمبر آخر الزماں کی مقدس ہجرت گاہ ہے یہاں تمہارا یہ حکم ہرگز جاری نہ ہوگا۔" بادشاہ اپنے ارادے سے باز آیا اس کے سینے میں عقیدت و محبت کی کرن جاگی اور اس کے ہمراہ جو چار سو علما آئے تھے انہوں نے یہاں سے جانا پسند نہ کیا اس سے پہلے کہ بادشاہ یہاں سے روانہ ہوتا اس نے سب کے رہنے کے لئے گھر بنوائے۔ سیم و زر اور غلام دیئے اس کے علاوہ الگ سے ایک گھر پیغمبر آخر الزماں کے لئے بھی تعمیر کرایا اور اللہ کے آخری پیغمبر کے نام ایک انتہائی عقیدت مندانہ خط لکھا اس پر سونے کی مہر لگا کر یہودی عالم شامول کے حوالہ کیا اور یہ وصیت کی کہ اگر تجھے پیغمبر آخر الزماں کا دیدار نصیب

ہو جائے تو میرا یہ خط ان کی خدمت میں حاضر کرنا ورنہ تیری اولاد میں سے جسکے زمانے میں بھی انکا ورود ہو وہ میرا یہ خط ان کی بارگاہ میں حاضر کر دے چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو شامول کے اکیسویں پشت سے تھے حضرت ابو لیلیٰ کے ذریعہ وہ خط حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مکہ شریف بھجوایا اور مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی۔

حضرت ابو لیلیٰ نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر وہ خط پیش کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا "میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ آپ نے تین بار یہ فرمایا "مرحبا بالاخ الصالح" بادشاہ یمن نے اپنے خط میں جو اشعار لکھے وہ یہ ہیں ؎

شہدت علی احمد انہ رسول من اللہ باری النسم
فلو مد عمری الی عمرہ لکنت وزیرا لہ وابن عم

یہی دو اشعار نعتیہ شاعری کے اولین نمونے ہیں چنانچہ جب آپ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کی اونٹنی قصویٰ حضرت ابو ایوب انصاری ہی کے مکان کے سامنے ٹھہری اور آپ نے اس مکان میں قیام فرمایا۔

"تاریخ ابن عساکر" میں اس واقعہ کا ابتدائی ذکر دوسرے انداز سے ہے مگر مدینہ تشریف آوری کا واقعہ اسی طرح ہے۔

شعر و شاعری عربوں کے خمیر میں داخل تھی قبل اسلام ہی سے گھر گھر شعری ذوق، فصاحت و بلاغت اور استعارات و تشبیہات کا چرچا تھا والدہ ماجدہ سرکار دو عالم حضرت آمنہ خاتون بھی برجستہ اشعار کہنے پر ملکہ رکھتی تھیں آنحضرت کو ایام طفلی میں دائی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کرتے وقت اور ایام رضاعت کے بعد واپسی پر آپ سے دو رباعیاں منسوب ہیں سپرد کرتے وقت جو دعائیہ رباعی کہی وہ یہ ہے۔

اُعیذہ باللہ ذی الجلال من شر ما مر علی الجبال
حتی اراہ حامل الحلال و یفعل العرف الی الموال

وغیرھومن خشیت الرجال

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے آپ کے مربی وسرپرست حضرت خواجہ ابوطالب نے نعتیہ اشعار کہے جنکی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں ہے مگر اعلان نبوت کے بعد انہیں اشعار سے نعتیہ شاعری کی ابتدا ہوتی ہے اللہ کے رسول جب مکہ سے ہجرت فرمانے لگے تو راستے میں ام معبد نام کی ایک خاتون نے رسولِ خدا کو پہلی بار دیکھا تو بے حد خوش ہوئی اس نے ضیافت کی اور شاعری کی زبان میں مدح وثنا کی۔ آپ اپنی ہجرت گاہ مدینہ منورہ کی سرزمین میں داخل ہوئے تو مدینے کے ذرے ذرے نے پلکیں بچھائیں آپ کا استقبال کیا اور بنی نجار کے سارے بچے بچیاں گلیوں میں اور عورتیں اپنی چھتوں سے اپنی مسرتوں کا اظہار کرتے ہوئے یہ مدحیہ نظم پڑھنے لگیں۔

طلع البدر علینا   من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا   ما دعا لِلّٰہ داع
ایھا المبعوث فینا   جئت بالامر المطاع

ہجرت کے بعد دورِ نبوی میں ایک سے ایک باکمال اور قادر الکلام شاعر سامنے آئے جنہوں نے بہت تھوڑی سی مدت میں عربی نعتیہ شاعری کے فکر وفن اور اس کی تحریک کو عروج بخشا۔ رسول کریم کے خدام شعراء مردوں میں ایک سو ساٹھ تھے اور عورتوں میں بارہ تھیں جن میں سے حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن زہیر، حضرت عبداللہ بن رواحہ، اور حضرت زہیر بن صرمہ کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ حضرت حسان بن ثابت کو عام طور پر شاعر رسول کہا جاتا تھا اللہ کے رسول ممبر پہ بٹھا کر انکی نعت سماعت فرماتے تھے۔ ایک بار اللہ کے رسول نے حضرت عبداللہ ابن رواحہ سے پوچھا اخبرنی ما الشعر یا عبد اللہ (اے عبداللہ مجھے بتاؤ شعر کیا ہے؟) حضرت عبداللہ نے عرض کیا شئی یختلج فی صدری فینطق بہ لسانی۔

دکوئی چیز میرے سینے میں ہیجان پیدا کرتی ہے اور میری زبان گویا ہوتی ہے۔
(المجموعۃ النبھانیۃ حصہ اول ص ۳۸)

حضرت کعب بن زہیر کو بھی بارگاہ نبوت میں بے حد سرخروئی حاصل ہوئی آنحضرت نے جناب کعب کا قصیدہ "بانت سعاد" سماعت فرمایا تو بہت خوش ہوئے اور اپنی ردائے مبارک جناب کعب کو عطا فرمائی۔ تیسرے خوش نصیب شاعر حضرت عباس بن مرداس ہیں جن کی شاعری سے خوش ہو کر اللہ کے رسول نے حلّہ عطا فرمایا واقعہ یہ ہے کہ خلافت پر فائز ہونے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب شعراء کو تہنیت و مبارکباد پیش کرنے کے لئے منع فرمایا تو عدی ابن ارطاۃ جن کا حضرت عمر بہت احترام کرتے تھے آپ کے پاس آئے اور بولے "یا امیرالمومنین ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد مدح واعطیٰ وفیہ اُسوۃ لکل مسلمٍ اے امیرالمومنین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کی گئی ہے اور آپ نے اپنی مدح کرنے والے شعراء کو انعام واکرام سے نوازا آپ کی نعت ہر مسلمان کے لئے مشعل راہ ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عدی ابن ارطاۃ سے پوچھا من مدحہٗ "وہ کون مداح رسول ہے جسے رسول نے انعامات سے نوازا" عدی نے جواب دیا العباس بن مرداس فکساہ حلّۃ عباس بن مرداس وہ مداح رسول ہیں جنہیں سرکار نے حلّہ عطا فرمایا۔ (المجموعۃ النبھانیۃ حصہ اول ص ۴۲) چنانچہ ان مذکورہ شعرائے رسول کے علاوہ حضرت عائشہ حضرت علی، حضرت عباس، حضرت ابن عباس، ابوسفیان بن حارث، عدی ابن حاتم طائی، حمید بن ثور الہدیٰ عامر بن واثلہ، ایمن بن خزیمہ، لبید بن ربیعہ، نابغہ جعدی، اعشیٰ مازنی، اعشیٰ بکر بن وائل، عبداللہ زبعری، ابوعزی جمحی، اسد ابن ابی اناس، مالک ابن نمط، سعد بن سلمیٰ

مالک بن عوف، قیس ابن بحر اشجعی، عمرو بن سبیع، کلیب ابن اسید اور مازن غضنوبہ طائی وغیرہم نے بھی نعتیہ شعر و ادب کے بہترین نقوش چھوڑے ہیں اسی طرح مکہ و مدینہ اور دنیا کے دیگر مقامات میں ہر دور میں بتدریج نعتیہ شاعری کا فروغ ہوتا رہا اور ائمہ فقہا، محدثین، اصفیا اور عاشقان مصطفےٰ نے ہر عہد میں نعت گوئی کا فریضہ انجام دیا سرسری طور پر عرض کرتا ہوں کہ دوسری صدی ہجری میں امام ابو حنیفہ تیسری صدی ہجری میں امام بخاری چوتھی صدی ہجری میں ابن دُرید پانچویں صدی ہجری میں عبدالرحیم البرعی چھٹویں صدی ہجری میں حضرت غوث اعظم بغدادی اور شیخ احمد کبیر رفاعی ساتویں صدی ہجری میں علامہ محمد بن سعید بوصیری جابر الاندلسی، محمود الحلبی، ابن الفارض، شیخ یحییٰ بن یوسف الصرصری اور ابن دقیق العید۔ عہد رسالت کے بعد ساتویں صدی ہجری میں عربی نعتیہ شاعری کا سب سے زیادہ فروغ ہوا۔ اس عہد کے امام الشعرا علامہ بوصیری ہیں جن کا قصیدہ "بردہ شریف" بارگاہ نبوت میں مقبول ہوا آپ نے یہ قصیدہ سرکار دو عالم کو خواب میں سنایا اس حالت میں کہ آپ مفلوج تھے۔ قصیدہ سماعت فرمانے کے بعد سرکار نے آپ کے فالج زدہ اعضا پر اپنا دست مبارک پھیرا بیدار ہونے کے بعد دیکھا تو پوری طرح صحتیاب ہو چکے تھے اس قصیدے کے فضائل و برکات بے شمار ہیں جس نیک و مستحسن مقصد غرض اور ارادے سے پڑھا جائے انشاءاللہ کامیابی ہوگی۔

چنانچہ اسی طرح آٹھویں صدی ہجری میں ابن خلدون، ابن سید الناس، امام تقی الدین سبکی اور علامہ خطیب بغدادی، نویں صدی ہجری میں علامہ ابن حجر مکی اور شمس الدین تواجی، دسویں صدی ہجری میں شیخ محمد البکری گیارھویں صدی ہجری میں شمس الدین محمد صالحی اور علامہ شہاب خفاجی مصری، بارھویں صدی ہجری میں عبداللہ شبراوی اور تیرھویں صدی ہجری میں شیخ حسین دجانی، محمود دیک، شیخ عبدالغنی نابلسی، شیخ حسین مخلوف اور علامہ یوسف ابن اسمٰعیل

(باقی صفحہ ۶۷ پر)

امام الشعرا مولانا غلام امام شہید

مولانا انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں " مولانا غلام امام شہید کے اجداد میں خواجہ سر السقطی کے پرپوتے امام صلاح الدین (قاضیٔ دمشق) سب سے پہلے دمشق سے ہندوستان آئے اور حکومت کی طرف سے شہر کے قاضی مقرر کئے گئے۔ بعدہٗ ان کے صاحبزادے کو امیٹھی کی قضاۃ ملی اسی وقت سے یہ خاندان امیٹھی میں آباد ہوا۔ (حیات شہید ص۲ مطبوعہ مرتضائی پریس آگرہ ۱۳۵۹ھ)

مولانا غلام امام شہید ۱۲۱۴ھ میں امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والد ماجد شاہ غلام محمد صاحب سے حاصل کی جو علم و فضل اور عبادت و ریاضت میں مشہور تھے مولوی حیدر علی سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی مفتی اکرام اللہ شہابی گوپاموی اپنی تصنیف "تصویر الشعراء" میں لکھتے ہیں " علم متداولہ از مولوی حیدر علی اکتساب نمودہ" تحصیل علوم کے بعد ملازمت اختیار کی کچھ عرصہ تک لکھنؤ میں تحصیلدار رہے۔ پھر صدر نظامت سے منسلک ہو کر آگرہ چلے گئے اور یہاں سررشتہ داری کے عہدے تک پہنچے۔ حضرت شاہ اکبر داناپوری جو اکثر آگرہ ہی میں قیام پذیر رہتے تھے اور مولانا شہید سے آپ کے تعلقات گہرے تھے۔ فرماتے ہیں " حضرت مولانا غلام امام شہید رحمۃ اللہ علیہ جن کا واسطۂ نسب ملا جیون صاحب استاد عالمگیر سے ملتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد مولینا محمد قاسم صاحب ابوالعلائی

قدس سرہٗ کے حلقۂ مسترشدین میں داخل تھے اور بیعت ان کو قادریہ طریقہ میں اپنے والد ماجد سے تھی جس روز ہمارے حضرت کے حلقۂ استرشاد میں، بمقام آگرہ داخل ہوئے ہیں یہ غزل تصنیف کر کے حضور کی نذر کی حضور نے مدار بخش قوال کو حکم کیا کہ اسکو ابھی یاد کر کے سناؤ پس اس وقت عجیب لطف تھا اس غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:

سیدنا ابوالعلا جان و دلم فدائے تو | دیدۂ مہر و ماہ را سرمہ زخاک پائے تو
در دشہید خویش را از سر رحم کن دوا | از در تو رود کجا خستہ تو گدائے تو

حضرت والد ماجد قدس سرہٗ (یعنی حضرت شاہ محمد سجاد ابوالعلائی) سے اور مولانا سے بہت اتحاد تھا۔ میں کم عمری ہی سے آپ کی آغوش شفقت میں پلا۔ میں آپ کو چچا کہتا تھا اور آپ کے کل خاندان کے لوگوں سے پورا پورا برتاؤ برادری کا تھا۔" آگے لکھتے ہیں یہ جو ہندوستان میں میلاد شریف کی مجلسیں ہوتی ہیں یہ حضرت مولانا ہی کی قائم کی ہوئی ہیں جو شخص آگرہ میں مجلس میلاد کرتا وہ پڑھنے کو آپ ہی کو بلاتا اگر وہ غریب آدمی ہوتا تو آپ اس کو دس پانچ روپئے اپنے پاس سے دیدیا کرتے اور فرماتے کہ اس میں سامان میلاد کرو تمام شب میلاد خوانی میں گذر جاتی۔

(اشرف التواریخ حصہ اول مطبع آگرہ اخبار، نئی بستی ۱۳۲۲ھ ص ۴۲)

اسی مضمون سے یہ بھی پتہ چلا کہ آپ آگرہ کے موتی کٹرہ میں ٹینی مل کی مشہور حویلی میں رہتے تھے۔ مولانا انتظام اللہ شہابی کی تحریر کے مطابق ۱۲۷۰ھ میں کچھ سرکاری مسائل کے پیش نظر صدر نظامت کے جملہ وکلاء اور حکام پر رشوت کے مقدمات قائم کئے گئے جس میں مفتی نوراللہ، حضرت شہید، محمد شفیع سرکاری وکیل اور مولانا قاسم دانا پوری مثل خواں وغیرہم بھی

لپیٹ میں آگئے. مگر تحقیقات کے بعد اصلیت کچھ نہ سامنے آئی اور مقدمات اٹھا کر سب کو بری کیا گیا۔ (حیات شہید ص۵)۔ اس کے بعد مولانا ملازمت ترک کر کے الہ آباد چلے آئے اور تادم آخر الہ آباد ہی میں رہے۔ وہ یہاں کچھ عرصہ تک پیشکاری کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

شاعری کا ذوق پیدا ہوا تو اردو میں استاد مصحفی کے شاگرد ہوئے فارسی نظم میں مرزا قتیل فرید آبادی اور فارسی نثر میں آغا سید اسمٰعیل مازندرانی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ مصنف خمخانۂ جاوید لالہ سری رام کی اطلاع کے مطابق شیخ غلام مینا ساحر سے بھی استفادہ کیا تھا۔ (جلد پنجم ص۲۱۱) آپ کا سینہ عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں سرشار اور جوش عقیدت سے معمور تھا فطری رجحان و میلان کی روشنی میں نعتیہ شاعری سے گہری دلچسپی رکھی۔ آخر تک اس راہ پر گامزن رہے اور کمال پیدا کیا۔ مذہبی شاعری کی بنیاد اگرچہ لکھنؤ اور اس کے اضلاع میں کافی پہلے سے قائم ہو چکی تھی جسے ہم عارفانہ و صوفیانہ شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔ نعتیں بھی لکھی گئیں لیکن غزل کی ہیئت میں نعت گوئی کا رواج مولانا غلام امام شہید ہی کے زمانے میں شروع ہوا اور اپنے ہم عصروں میں آپ کے فنی و فکری معیار کو سب پر فوقیت حاصل ہوئی۔ مشیر احمد کاکوروی لکھتے ہیں۔

"دور وسطی میں ناسخ و آتش نے صرف غزل کو جولانگاہ بنایا۔ اس دور کی شاعری میں دو اسکول نظر آتے ہیں. حنفی اور شیعی، حنفی اسکول نے خلفائے راشدین کی شان میں قصائد لکھے لیکن شیعی اسکول میں مناقب اہلبیت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مولوی غلام امام شہید جو امیٹھی

مضافات لکھنو کے باشندہ تھے انھوں نے اودھ میں
مذہبی شاعری کا سنگ بنیاد رکھا اور غزل، مثنوی، قصیدہ
ترجیع بند غرضیکہ اصناف شاعری میں نعت گوئی کو وسیلۂ
نجات تصور کیا۔ (ماہنامہ نگار ص۱۸۶ جنوری ۱۹۶۲ء)

آپ کی نعتیہ شاعری اور میلاد خوانی کی شہرت دور دور تک گئی لکھنؤ کے بعد جہاں جہاں بھی گئے اور رہے شمع عشق رسالت کی لو ہمیشہ تیز کرنے میں مصروف رہے اور فروغِ نعت کو اپنا فریضہ تصور کیا چنانچہ آگرہ کی ملازمت ترک کی تو ریاست حیدرآباد دکن کی جانب سے چار سو تیس روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو ساری عمر ملتا رہا محی الدولہ (محی الدین) بہادر، مولانا شہید کے بہت عقیدت مند تھے سب سے پہلے آپ ہی نے ایک ہزار روپے زادراہ بھیج کر حیدرآباد آنے کی دعوت دی جہاں مولانا شہید کی بے پناہ قدر و منزلت ہوئی۔ مولانا انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں "سالانہ بارہ ربیع الاول کو محی الدولہ اور افضل الدولہ کے یہاں میلاد کی محفلیں ہوا کرتی تھیں تو آپ خود آگرہ و الہ آباد سے جا کر میلاد پڑھتے۔ فرماتے ہیں:

فرشتوں تک یہ پہنچی ہے جو خوشبو — تو کہتے ہیں کہ یہ مجلس کہاں ہے
محی الدین کے گھر میں ہے مجلس — کہ اس سے عطر یہ دربار جہاں ہے

(حیات شہید ص۸

ایک بار آپ رامپور تشریف لے گئے تو والیٔ رامپور سر سالار نواب کلب علی خاں نے آپ کی خوب آؤ بھگت کی اور عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے یہیں سے مولانا شہید نے سفر حج کا بھی ارادہ کیا اس موقع پر آپ کی خدمت

میں کافی نذرانے پیش کیے گئے حیدرآباد دکن میں آپ کو امام الشعراء کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

مولانا شہید فارسی اور اردو کے نہ صرف نثار اور شاعر بلکہ زبردست عالم بھی تھے آپ کی عالمانہ حیثیت مسلم تھی فارسی میں قصائد و غزلیات کا ضخیم سرمایہ چھوڑا ہے جسے خواجہ غلام غوث بے خبر نے مرتب کیا تھا۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں " فارسی میں صاحب دیوان تھے ان کو اپنی فارسی پر ناز تھا مگر حضرت غالب مرحوم نے اپنے ایک شاگرد کو خط لکھتے ہوئے ان کے کلام پر کوئی عمدہ رائے نہیں ظاہر کی ہے۔ (خمخانہ جاوید جلد پنجم صد ۲۱۱)

خود غالب کے فارسی کلام پر بھی دانشوران ہند و ایران نے کوئی مستحکم رائے نہیں قائم کی ہے چونکہ مرزا غالبؔ مرزا قتیلؔ سے نفرت و عناد رکھتے تھے اس لئے تلمیذ قتیل ہونے کی وجہ سے وہ مولانا شہید سے بھی نفرت کرتے اور ان کی فارسی شاعری کو خاطر میں نہ لاتے مگر مولانا شہید فارسی کے زبردست شاعر سمجھے جاتے تھے اردو نثر و نظم میں بھی کمال پیدا کیا۔ اردو نثر میں " انشائے بہار بے خزاں " کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ تصنیف خطوط و مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ حضرت خواجہ غلام غوث بیخبر نے ترتیب دیا تھا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں :

" آپ کی تحریر پرانے رنگ کی تھی یعنی قافیہ پیمائی اور رنگینی سے عبارت خالی نہیں لیکن پھر بھی سلاست اور دلچسپی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بیان میں شاعرانہ تصرف ضرور ہے لیکن زور بھی کافی ہے تاج گنج کے روضے پر جو مضمون لکھا

ہے وہ اس رنگ کے لحاظ سے بہترین ہے مگر فطری عنصر، تصنع اور مبالغہ آرائی کے پردے میں رہ جاتا ہے۔

(مختصر تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۰۶ مطبوعہ الہ آباد سنہ ۱۹۸۲ء)

نسیم قریشی رقم طراز ہیں :

نثر میں دو کتابیں ہیں "مجموعہ میلاد شریف اور انشائے بہار بے خزاں" شہید کی تحریریں پرانے رنگ کی ہیں عبارت میں قافیہ پیمائی اور رنگین بیانی کا التزام ہے اس کے باوصف سادگی اور دلچسپی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تاج گنج پر شہید کا مضمون قدیم طرز انشاء کا ایک بہت شاندار نمونہ ہے۔

(اردو ادب کی تاریخ صفحہ ۱۴۲ مطبوعہ علی گڈھ سنہ ۱۹۶۹ء)

مولانا شہید کا وہ مضمون جو روضہ تاج گنج یعنی تاج محل سے متعلق ہے اس کی ایک مختصر عبارت ملاحظہ کیجئے اور یہ اندازہ لگائیے کہ اپنے عہد کی اس تحریر میں کتنی سلاست و روانی کیف و سرور، حسن ظن اور لچک موجود ہے کہ مزاج میں حلاوت پیدا کر دیتی ہے۔

سبحان اللہ کیا روضہ ہے کہ رضواں جس کے لطف و لطافت سے راضی و خوشنود ہے بارک اللہ کیا باغ ہے جس میں جنت کی ہر نعمت موجود ہے۔ سورج اس باغ کا زرد آلو ہے چاند اس کے صحن کا خوشبو ہے۔ پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اوپر اٹھائے تو اس کو آفتاب کی پگڑی سنبھالنی دشوار ہو جائے دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ چوب قلم سے جو لکھا ہے عقل اس طلسمات سے حیران ہے کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے ویسا دور

سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے مبصر انصاف سے دیکھیں کہ یہ بات کیسی شکل اور کس طرح تقسیم کامل ہے۔ ہزآت مرمریہ سنگ موسیٰ کی پچی کاری کہئے یا آنکھوں کی سفیدی پر پتلیوں کی سیاہی کی نمود اری۔ حرف ہیں یا کافور کے قرص پر مشک کے دلنے پڑے ہیں۔ لفظ ہیں یا تختی پر نیلم کے نگینے جڑے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میر گلزار علی اسیر خلف نظیر اکبرآبادی جو خلیفہ کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ اسی تاج گنج آگرہ کے مدرسہ میں عرصۂ دراز تک مدرس رہے جو اپنے وقت کا ایک معروف تعلیمی ادارہ تھا۔

مولانا شہید کی دوسری تصنیف "رمز الشہادتین" (مطبوعہ کاشی پریس آگرہ سنہ ۱۲۶۹ھ) ہے جو فضائل اہلبیت اور واقعات کربلا کے موضوع پر ہے مستند حدیثوں معتبر روایتوں اور حوالوں کی روشنی میں یہ ضخیم تصنیف بڑی اہمیت کی حامل ہے اور بالکل مولودی انداز پر لکھی گئی ہے اس کتاب کا انداز تحریر "انشائے بہار بے خزاں" سے مختلف اور نکھرا ہوا ہے مولانا شہید چونکہ فارسی کے بھی ماہر شاعر تھے اس لئے واقعات و فضائل کا ذکر کہیں کہیں فارسی میں بھی نظم کیا گیا ہے مگر منظومات کا حصہ بہت مختصر ہے پوری کتاب نثر پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

شمع حرم لم یزلی را کشتند — پروردۂ آغوش نبی را کشتند
کردند خراب خانۂ دلہا را — نور دل مرتضیٰ علی را کشتند ص۴

افسوس کہ اکثر محققوں اور مورخوں نے اس اہم نثری کارنامے کو ہمیشہ بھلائے رکھا۔

مولانا غلام امام شہید ایک سچے عاشق رسول خدا اور مداح حبیب

تھے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عشق رسالت کے بے شمار چراغ روشن کئے، ان کے جذبۂ صادق کا سارا سرمایہ محبت رسول ہی کا مرہون منت ہے اسی بنیاد پر حیدر آباد دکن میں انہیں امام الشعراء جیسے مقدس خطابات سے بھی نوازا گیا۔ عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی مولانا شہید کی معرکہ آرا تصنیف "مولود شہید" (مطبوعہ احمدی پریس کانپور سنہ ۱۳۰۲ھ) ہے جو نثر و نظم دونوں کا دلکش اور حسین امتزاجی تحفہ ہے اس کتاب کو بے پناہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اور اس دور کے تقریباً سبھی مطابع برسوں تک "مولود شہید" کی طباعت کرتے رہے ہمارے معاشرے میں کتاب سامنے رکھ کر میلاد خوانی کا رواج بہت قدیمی ہے اور چونکہ دیہاتوں اور قصبوں میں علماء و مقررین بہت مشکل سے مل پاتے ہیں اس لئے اس مجبوری کے تحت کتب مولود کی ضرورت محسوس کی گئی اور بتدریج بہت سی کتابیں لکھی گئیں اردو میں ابتدائی دور کی کتاب مولود شہید اسی مقصد کے لئے لکھی گئی تھی چنانچہ اس عظیم خدمت کے علاوہ محفلوں اور گھروں میں جاکر میلاد پڑھنا بھی مولانا شہید کا محبوب مشغلہ تھا وہ دیوانہ وار کوشاں رہتے کہ شمع عشق رسالت کی تو تیز سے تیز تر ہوتی جائے اور ہر جگہ ذکر رسول کی محفلیں سجتی سنورتی رہیں۔

آپ ساری زندگی نعت گوئی اور محفل میلاد کے انعقاد کی تبلیغ فرماتے رہے لوگ آپ کو بڑے ادب و احترام کے ساتھ میلاد خوانی کی دعوت دیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنی منظومات میں متعدد محفلوں اور اصحاب خانہ کے جذبۂ خیر کا ذکر کیا ہے آگرہ کے بعد جب آپ مستقل طور پر الہ آباد آئے تو آپ کی آمد سے سرزمین الہ آباد میں عشق و محبت اور عقیدتمندی کی ایک نئی جوت جاگی رسم میلاد خوانی میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور نعت گوئی کی روایت کو غیر معمولی

فروغ حاصل ہونے لگا۔ سید شمیم احمد لکھتے ہیں :۔

میلاد خوانی کی حیثیت سے غلام امام شہید نے سب سے
زیادہ شہرت پائی اور لکھنؤ کے ممتاز شعراء میں تھے
عشقِ رسول میں سرشار تھے واقعات کے لحاظ سے ہو سکتا
ہے کہ انھوں نے بھی صحت کا پورا خیال نہ کیا ہو مگر فنی اعتبار
سے غلام امام شہید کا میلاد سب سے زیادہ معیاری ہے
اور علمی حلقوں میں بھی اسے پسند کیا گیا دوسری معیاری
کتب مولود میں مولود طپش اور میلاد اکبر کا نام بہت مشہور
ہے۔ (نقوش کا رسول نمبر جلد ۴ صفحہ مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۸۳ء)

یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں مولودی کتابیں کثرت سے لکھی گئیں جن میں معیاری و غیر معیاری دونوں شامل ہیں۔ عام رواج ہونے کے سبب بے شمار کتابیں تجارتی نقطۂ نظر سے بھی شائع کی گئیں جنکی صحت کا کوئی خیال نہ رکھا گیا۔ لیکن جہاں تک مولانا شہید کی اہمیت کا تعلق ہے وہ ایک صاحب علم و فضل اور بڑے محتاط عالم تھے ۔ مولود شہید نہ صرف فکری و فنی بلکہ صحتِ واقعات و روایات کے لحاظ سے بھی جامع ہے اسی وجہ سے اس کو علمی حلقوں میں خوب سراہا گیا بالخصوص اس کے شعری حصے کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی مثلاً نور رسول کی فضیلت، آمد رسول، آمد رسول کی پیش گوئیاں، حمل حضرت آمنہ، حکمت معراج، بیان معراج، وفات رسول اکرم، قصہ حضرت بلال، قصۂ یہود، روایت استن حنانہ اور قصۂ حلیمہ سعدیہ جیسے عناوین و موضوعات کے تحت قصیدوں، مثنویوں اور غزلوں سے مولانا شہید کی شعری بلندیوں اور فن پاروں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

ساری نظمیں کثیر شعروں پر مشتمل ہیں۔ مولود شہید میں متعدد سلام و مناجات کے علاوہ مختلف شعرائے فارسی کے کلام پر اردو اور فارسی میں خمسے بھی موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں غور طلب بات یہ بھی ہے کہ مولود شہید کے مختلف نسخوں کا تجزیہ کرنے کے نتیجے میں بہت سے نسخے تحذیف شدہ بھی نظر آتے ہیں اور پبلشروں نے ان کی منظومات کو اپنے طور پر الگ الگ ڈھنگ سے بھی ترتیب دے ڈالا ہے۔ ویسے مولانا شہید کا ایک اور شعری مجموعہ جو "قصائد نعتیہ" (مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۲۹۲ھ) کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے پیش نظر مولود شہید کا ایسا کوئی نسخہ نظر نہیں آتا جسکی بنیاد پر مولود شہید کو مولانا شہید کے اردو کلام کا مکمل سرمایہ تصور کیا جائے۔ مولود شہید کی چند نظموں کو اگرچہ ناشروں اور مرتبوں نے قصائد نعتیہ میں ضرور شامل کر دیا ہے لیکن اس مجموعہ کی ایک الگ حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پورا مجموعہ قصائد اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ متعدد قصیدے ماہ ربیع الاول کے فضائل و اوصاف سے متعلق ہیں۔ پہلا قصیدہ ۶۵۰ اشعار میں پھیلا ہوا ہے۔ جسے آپ نے حیدر آباد میں اپنے ایک عقیدتمند محی الدولہ بہادر کے یہاں ایک سالانہ مجلس میں سنایا تھا۔ اس مجموعہ کی تاریخی انفرادیت اس کی نعتیہ غزلیں ہیں اور یہی وہ نعتیں ہیں جو غزل کی شکل و ہیئت میں سامنے آکر نہ صرف مولانا شہید کے انقلابی کارنامے کو واضح کرتی ہیں بلکہ صنف نعت کو پائدار بنا کر اردو ادب کی قسمت بھی سنوارتی ہیں۔ کیسی کیسی معیاری اور جامع غزلیں کہی ہیں۔ اگر ایک طرف حرف حرف سے مولانا کی عقیدت و محبت اور وارفتگی و شوق کی چمک جھلک پڑتی ہے تو دوسری جانب فکر و فن، پختگی و مہارت اور ہمہ دانی و بیساختگی کا دریا بہتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ اظہار کوائف قلب و

نظر اور احساس معصیت ان کی شاعری کا روشن خاصہ ہے۔ جلوۂ روحانی کی بارگاہ میں جتنی بھی غزلیں کہی ہیں ان کی کشش و معیار کا سلسلہ کہیں ٹوٹتا نظر نہیں آتا اردو کی نعتیہ شاعری کی یہ نئی ادا، یہ نیا انداز، یہ نئی آنچ یہ نیا بانکپن اور یہ نئی لچک مولانا شہید نے عطا فرائی ہے اور نعتیہ غزل کی ہیئت سازی میں انقلاب پیدا کرتے ہوئے تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں قابل فخر خدمات انجام دی ہیں۔ "قصائد نعتیہ" میں متعدد غزلیں فارسی میں بھی ہیں اور کئی اردو غزلیں طویل بحروں میں۔ طویل بحروں کے استعمال میں مولانا شہید غضب کی مہارت رکھتے تھے۔ اس کے لیے منتخب الفاظ کی خوبصورت آمیزش اور مفاہیم کی امتزاجی کیفیت کو متوازن اور باوقار رکھنا کوئی آسان کام نہیں مگر مولانا شہید نے اپنے اس فن کا بخوبی مظاہرہ کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

وہ بادشاہ دو جہاں وہ قبلہ گاہ مقبلاں وہ رہ نمائے انس و جاں وہ دستگیر بیکساں
وہ راحم دلخستگاں وہ چارۂ درد نہاں وہ مصدر فیض عیاں وہ مظہر سر دعلن

کیا حسن پر کار خسار ہے کیا طرہ طرار ہے کیا نرگس بیمار ہے کیا ابروئے خم دار ہے
کیا لب ہیں کیا گفتار ہے کیا قد ہے کیا رفتار ہے کیا جامہ کیا دستار ہے پوشاک کی نکھو پھبن

عمامہ جو ہے زیب سر اس کی صفائی دیکھ کر ہوتا ہے گردا قمر خورشید ہے رو کھی سحر
پٹکا تو دیکھو کس قدر ہے زینت موئے کمر اس قامت بے سایہ پر کتنا ہے زیبا پیرہن

یہی سلاست روانی، لچک و پرکاری اور حسن عقیدت کی بے ساختگی انکی چھوٹی بحروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ؎

دریائے فیض موجود ہے وہ حسن کے سامنے

تنکے سے کم ہے کوہ بھی گر ہو گناہ کا

عشق میں تیرے ہوئے جامے سے ایسے باہر
کہ پھرا کرتے ہیں عریاں گل و آئینہ و شمع

مژگاں سے کریں راہ کی جاروب کشی ہم
سو کوس سے گر ہم کو نظر آئے مدینہ
اللہ رے مہتابیٔ زیبا کی صفائی
مہتاب ہے خاکستر صحرائے مدینہ

ان کے رخ صبیح پر زلفیں ہیں مشک فام دو
قدرت حق کو دیکھئے ایک سحر ہے شام دو
آج شہید بینوا پڑھتا ہے نعت مصطفےٰ
جمع ہوں خاص و عام دو، سب کو یہی پیام دو

سید محمد مرتضیٰ بیاںؔ (۱۸۵۶ء/ ۱۹۰۰ء) ایک مسلم الثبوت شاعر اور نامور اساتذہ میں تھے۔ ان کی جملہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے نعتیہ کلام کے ذکر میں ماہنامہ العصر کے مدیر پیارے لال شاکر لکھتے ہیں :-

" اس صنف خاص میں متاخرین شعرائے اردو میں حضرت محسن کاکوروی نے قابل رشک امتیاز حاصل کیا ہے۔ حضرت غلام امام شہید بھی مداح رسول امی کی حیثیت سے نہایت

ناموری پا چکے ہیں ان بزرگوں کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت ان کی وہ تاثیر ہے جو صرف سچے عاشقان رسول کے دلوں میں پیدا ہو کر زبان اور قلم سے نکل سکتے ہیں۔"

آگے مزید لکھتے ہیں :-

"سید بیانؔ کا نعتیہ کلام محسنؔ و شہیدؔ کے برابر نہیں رکھا جا سکتا۔"
(خدا بخش خاں لائبریری جنرل، مشترکہ شمارہ ۱۳-۱۴-۱۵-۱۶ صفحہ ۱۴۰ مطبوعہ پٹنہ ۱۹۸۰ء)

حقیقت ہے کہ نعتیہ شاعری میں ایک نیا انقلاب اور نیا رنگ و آہنگ اجاگر کرنے پر مولانا شہید کی سعی بلیغ تاریخی حیثیت کی حامل ہے لیکن اس کے باوجود تاریخ اردو ادب کی اکثر کتابیں ان کے ذکر سے خالی نظر آتی ہیں بعض کتابوں میں کہیں کہیں معمولی یا رسمی ذکر کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ جناب ابوالحسن علی ندوی کے والد جناب حکیم سید عبدالحئی مورخ نے بھی اپنی تصنیف "گل رعنا" میں مولانا شہید کو نظر انداز کیا ہے جب کہ اسی دور کے مداح رسول کرامت علی خاں شہیدی کا تذکرہ موجود ہے۔

ایک نامور ادیب و شاعر کے علاوہ مولانا شہید کی مجاہدانہ حیثیت بھی مسلم ہے اور کتب تواریخ میں آپ کا نام محفوظ ہے ۱۸۵۷ء کے دوران بیشتر مشاہیر علماء اور مجاہدین آزادی کے ساتھ تحریک جنگ آزادی میں آپ بھی شامل رہے اور کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کے علاوہ آپ کے عقیدت مندوں اور تلامذہ کی بھی خاصی تعداد تھی بالخصوص، لکھنؤ، آگرہ الہ آباد، رامپور، مراد آباد اور دکن وغیرہ کے علاقوں میں آپ کے سیکڑوں تلامذہ تھے۔"حیات شہید" کے مرتب مولانا انتظام اللہ شہابی کی اطلاع کے

مطابق مولوی احمد خاں صوفی اکبر آبادی آپ کے ارشد تلامذہ سے تھے ھذا مشہور عالم و ادیب اور شاعر حضرت خواجہ غلام غوث خاں بہادر بیخبر مولانا شہید کی عظمت و رفعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس طور پر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

قطعۂ تاریخ وفات

شاعر بے مثل غلام امام
ساحری از شاعریش شد پدید

صوفی و صافی و روشن ضمیر
حاجی و مداح رسول حمید

قطع تعلق از ہمہ کار کرد
داد دل و عشق پیمبر خرید

داشت امام الشعرا در خطاب
خوش بسخن کرد تخلص شہید

خنجر برّان اجل ناگہاں
از دم خود تار حیاتش برید

تافت ازیں غمکدۂ تیرہ رو
رفت و بگلزار ارم آرمید

بیخبر غمزدہ اندر غمش
چارہ بجز صبر و رضا چوں ندید

گفت بتاریخ ہم آخر ز رنج
وائے امام شعرا شد شہید

سنہ ۱۲۹۶ھ

۱۲۹۶ھ میں آپ نے الہ آباد میں دار فانی کو خیر باد کہا۔ کالا ڈانڈا قبرستان میں تدفین ہوئی بزرگوں سے ہزار دریافت کرنے کے باوجود آپ کے مزار کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دیوانۂ صادق کی قبر پر رحمتوں کی بارش نازل فرمائے اور مرحوم و مغفور کی نعتیہ خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

نمونۂ کلام

مداح ہوں جناب رسالت پناہ کا
عرش بریں پہ گوشہ ہے میری کلاہ کا

محفل میں میری نغمہ سرائی سے شور ہے
ہر سمت آہ آہ کا اور واہ واہ کا

زیبا ہے فخر و ناز مجھے جس قدر کروں
دیکھو تو مدح خواں ہوں میں کس بادشاہ کا

دریائے فیض وجود ہے وہ جسکے سامنے
تنکے سے کم ہے کوہ بھی گر ہو گناہ کا

اوس جا پہ عذر خواہی ہماری کریگا وہ
جس جا پہ زہرہ آب ہو ہر عذر خواہ کا

پیغمبروں کو فخر ہوا اوسکی ذات سے
سرداری سے بڑھتا ہے رتبہ سپاہ کا

سرسبز کیا ہوں اس رخ زیبا کے روبرو
منہ کیا ہے شمع بزم کا یا مہر و ماہ کا

شبنم کی کیا مجال جو گلگشت کر سکے
جس گلستاں میں پاؤں نہ ٹھہرے نگاہ کا

عاشق کے دل سے آہ نکلتی ہے اسلئے
اوسکے سوا مقام نہیں دل میں آہ کا

کالک تو میرے منہ کی چھٹے اب کسی طرح
ہوے گذر مدینے میں مجھ روسیاہ کا

درپیش ہے عدم کا سفر سب کو دوستو
جو نعت کا کلام ہے توشہ ہے راہ کا

پیغمبروں کا شاہد عادل ہے وہ شہید
کیا مرتبہ ہے نام خدا اس گواہ کا

(۲)

آئی بہار اب ہر چمن ہے بلبل و گل کا وطن دیر و حرم سے نعرہ زن آتے ہیں شیخ و برہمن
زاہد سے کہہ دو یہ سخن ہے فصل گل توبہ شکن چاہے عیش جان و تن میخواروں کا سیکھے چلن
آئی بہار جانفزا لائی گلستاں میں صبا پیغام وصل دلربا گل کھل کھلا کر ہنس پڑا
موج ہوا نے وا کیا ہر غنچے کا بند قبا بلبل یہ کرتی ہے صدا اب میں ہوں اور سیر چمن
ساقی جو شوخ و شنگ ہے مست مے گلرنگ ہے مطرب جو خوش آہنگ ہے محو نوائے چنگ ہے
دل عیش کا اور رنگ ہے غم خستہ و دل تنگ ہے بلبل ہے خوشدل رنگ سے شادی سے گل ہے خندہ زن

شمشاد نے گلزار سے گلزار نے گلنار سے گلنار نے رخسار سے رخسار نے دیدار سے
دیدار نے گفتار سے گفتار نے رفتار سے رفتار نے دلدار سے سیکھا ہے شوخی کا چلن
سلطان دیں پیدا ہوا شاہ زمن پیدا ہوا ماہ حسیں پیدا ہوا عین الیقیں پیدا ہوا
مسند نشیں پیدا ہوا دل کا مکیں پیدا ہوا وہ نازنیں پیدا ہوا نازاں ہے جس سے جان و تن
وہ بادشاہ دو جہاں وہ قبلہ گاہ مقبلاں وہ رہنمائے انس و جاں وہ دستگیر بیکساں
وہ مرہم دلخستگاں وہ چارۂ درد نہاں وہ مصدر فیض عیاں وہ مظہر سر و علن
جس دم ہوا وہ جلوہ گر سب گر پڑا کسریٰ کا گھر اوسکی تجلی دیکھکر کہتے ہیں سب اہل بصر
یارب یہ کیسا ہے بشر جسکی ادا سے سر بسر آتا ہے عالم میں نظر سب سے نرالا بانکپن
ایام مولود آگئے آثار بہبود آگئے اوقات محمود آگئے اسباب مقصود آگئے
اعیان مسعود آگئے اعیان موجود آگئے راحت کے دن زود آگئے تازہ ہوئے عہد کہن
ہے بزم عیش جاوداں گم ہے شہید خستہ جاں دیوانہ دیکھو ہے کہاں کہدو کہ حاضر ہو یہاں
وہ بلبل ہندوستاں ہو فارسی میں نغمہ خواں مشتاق ہیں پیر و جواں سب نکتہ سنجان دکن

(۳)

اوس کے رخ صبیح پہ زلفیں مشک فام دو
قدرت حق یہ دیکھئے ایک سحر ہے شام دو
کعبہ و عرش بھی مقام اوسکو ملے ہیں دو مقام
بادہ ہے ایک جام دو ایک ہوا ہے جام دو
ایک حدیث مصطفےٰ دوسرا مصحف خدا
دین کے لئے ہیں رہنما کافی ہیں یہ کلام دو
حق نے اسے کیا سلام اوسنے ہمیں دیا سلام
ہم نے بھی لے لیا سلام شوق سے یہ سلام دو

مظہر نور کبریا کوئی نہیں ترے سوا
تیغ جب ایک ہو بھلا او سکے ہوں کب نیام دو
ایک نبی کے ہاتھ سے ایک علی کے ہاتھ سے
کوثر سلسبیل کے ہم کو ملیں گے جام دو
کیا ہی حسن حسین کا حسن دیکھ تو ذرا
میری تو آنکھوں کی ضیا پتلیاں ہیں امام دو
آج شہید بینوا پڑھتا ہے نعت مصطفےٰ
جمع ہوں خاص و عام دو سب کو یہی پیام دو

(۴۲)

اے صنم تجھ پہ ہیں قربان گل و آئینہ و شمع
ہیں ترے رخ سے پشیماں گل و آئینہ و شمع
دیکھ خنداں کبھی ہیں حیراں کبھی ہیں گریاں کبھی ہیں
دیکھ کر صورت جاناں گل و آئینہ و شمع
بلبل و طوطی و پروانہ نہیں چاہتے ہیں
تیرے ہوتے ہوئے اے جاں گل و آئینہ و شمع
عشق میں تیرے ہوئے جامہ سے باہر ایسے
کہ پھرا کرتے ہیں عریاں گل و آئینہ و شمع
رنگ اور نور و صفا لائے ہیں تیرے گھر سے
ہیں ترے بندۂ احساں گل و آئینہ و شمع
صاف کہتا ہوں کہو کس کے قلم سے نکلا
اس طرح دست و گریباں گل و آئینہ و شمع

میری کلک و غزل و صفحۂ دیواں کو شہیدؔ
کہتے ہیں سارے سخنداں گل و آئینہ و شمع

(۵)

جب سے ہوا وہ گل چمن آرائے مدینہ
جبریل بنا بلبل شیدائے مدینہ

سینہ ہے میرا رو کش صحرائے مدینہ
دل ہے جرس محمل لیلائے مدینہ

شرمسے کی جھاڑو دیکھ کے خورشید فلک سے
جاروب کش ساختنہ زیبائے مدینہ

اللہ رے مہتابی زیبا کی صفائی
مہتاب ہے خاکستر صحرائے مدینہ

بوسے کی تمنا ہے جو مینائے فلک کو
جھکتا ہے سوئے گنبد خضرائے مدینہ

مژگاں سے کریں راہ کی جاروب کشی ہم
سو کوس سے گر ہم کو نظر آئے مدینہ

آتا ہوں بڑی دور سے آلودۂ عصیاں
مولا مجھے مت کیجیو رسوائے مدینہ

اب خواب سے تسکیں نہیں ہوتی ہے شہیدا
بیداری میں خالق مجھے دکھلائے مدینہ

کرامت علی خاں شہیدی

کرامت علی خاں شہیدی ہڑیا پور ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے ملازمت کے سبب لکھنؤ میں زیادہ رہے عمر کے کچھ آخری ایام بریلی میں گذرے انتقال مدینہ منورہ میں ہوا۔

والد کا نام عبدالرسول خاں تھا شاعری اور علم عروض میں ماہر تھے اور درس و تدریس ان کا مشغلہ تھا شہیدی کی ابتدائی تعلیم کا ذکر اگرچہ کہیں نہیں ملتا تاہم "گلشن بیخار" کے مطابق حساب و عروض میں دستگاہ اور نمایاں مقام رکھتے تھے ممکن ہے دیگر علوم و فنون سے بھی اچھی واقفیت رہی ہو۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ملازمت شروع کی حکیم عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں "ابتدائے ملازمت میں وہ (یعنی شیخ عابد علی بلند دی) اور شہیدی نیچہ کی چھاؤنی (لکھنؤ) میں سرکار انگریزی کے ملازم ہوئے شہیدی کا تعلق کمسریٹ سے تھا۔ بڑے ہی زندہ دل، فراخ حوصلہ خوش مزاج اور یار باش قسم کے انسان تھے یار باشی میں سرکار کی کافی رقم صرف کر دی حساب طلب ہوا تو متحیر رہ گئے اور نتیجہ کے طور پر ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ اس حادثہ کا ان پر گہرا اثر ہوا ملازمت جانے کے بعد سیر و سیاحت

۱؎ گل رعنا ص ۳۳۲ مطبوعہ ۱۳۴۲ھ لکھنؤ۔

کرنے لگے بھوپال، اجمیر، پنجاب اور گجرات وغیرہ کا دورہ کیا۔ دہلی متعدد بار گئے۔ جہاں شیفتہ کی صحبت میں زیادہ رہنے کا موقع ملا۔

شہیدی شعر و سخن کی طرف جب مائل ہوئے تھے تو پہلے استاد مصحفی کے شاگرد ہوئے ان کے انتقال کے بعد شاہ نصیر سے اصلاح لینا شروع کی شہیدی کے گلشن میں ہر طرح کے پھول دکھائی دیتے ہیں اور تخیلات و تصورات کی مختلف خوشبوؤں کا احساس ہوتا ہے لیکن غم جاناں اور غم دوراں کی منزلوں سے گذرنے کے باوجود ان کی شاعری عشق حقیقی اور عشق رسالت کی آنچ میں بھی تپتی ہوئی نظر آتی ہے اور نعتیہ تصوری کو اپنی جملہ شاعری پر فوقیت دینے لگے۔ ؎

تری تعریف سے میری زباں میں آئی ہے تیزی
صفاہاں تک مسخر ہو گیا تیغ ہند کا

زندگی کے آخری ایام انتہائی وفور شوق میں گذرے زباں رہ رہ کر اسی تمنا کا اظہار کرتی رہتی۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

ہوئی ہے ہمت عالی مری معراج کی طالب
میسر ہو طواف اے کاش مجھ کو تیری مرقد کا

اور پھر وفات کے ایک سال قبل ان کی یہ دعا بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی ۱۲۵۵ھ میں مناسک حج ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی مکہ معظمہ سے حبیب خدا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا در دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے تو ۴ صفر ۱۲۵۶ھ کو راستے میں سخت بیمار ہو گئے نقاہت کا احساس ہوا مگر جذبہ عشق

ومحبت کے سہارے منزل مقصود کی طرف بڑھتے ہی رہے بالآخران کی یہ دیرینہ تمنا انھیں جبل مفرح تک پہنچا کر ہی رہی جہاں سے روضۂ اطہر صاف نظر آرہا تھا حضرت شہیدی نے اس کے نورانی جلوؤں پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور اسی دم طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا ۔ اسی واقعہ کو حضرت شاہ محمد اکبر داناپوری اپنی معرکہ آرا تصنیف اشرف التواریخ جلد اول میں اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"جب قافلہ جبل مفرح پر پہنچا اور وہاں سے گنبد خضرائے روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نظر آیا تمام قافلہ کے لوگ اونٹوں پر سے کود پڑے انھوں نے اپنے شغدف سے نظارہ کیا بیرانہ سالی کی وجہ سے اترنے سے مجبور تھے شغدف ہی میں دم نکل گیا جو شخص ضعیف ہوتا ہے اور اسے اترنے کی اور زیادہ چلنے کی قوت نہیں ہوتی وہ شغدف ہی میں بیٹھا رہتا ہے مگر ادبًا روضہ کی زیارت وہاں سے نہیں کرتا اور جو قوی اور توانا ہوتے ہیں وہ جبل مفرح ہی سے شغدف چھوڑ کر پیدل ہو جاتے ہیں ۔ یہ جو اترنے سے معذور تھے اس صدمہ سے ان کا دم نکل گیا ۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

(ص۴۲ مطبع آگرہ اخبار ۱۳۲۳ھ)

ایک روایت کے مطابق ان کی تدفین جنت البقیع میں ہوئی مگر قبر کہاں پر بنی شاید یہ آج تک نہ معلوم ہو سکا بقول الحاج شہیدی ؎

ناکامیٔ جاوید کی ہم مانتے منت
افسوس شہیدؔ ی تری تربت نہیں ملتی

ایک عاشق رسول کی خوش نصیبی ہے کہ جنت البقیع جیسی پاک اور مقدس خاک میں مدفون کی سعادت حاصل ہوئی حضرت لطف علی خاں، لطفؔ بریلوی کہتے ہیں :

عشق میں لطفؔ جو تو اوس سے کمتر ہوتا
ترا مرقد بھی شہیدی کے برابر ہوتا (دیوان لطف)

مجاہد جنگ آزادی مولانا غلام امام شہیدؔ کی تصنیف "مولود شہید" کی طرح دیوان شہیدی کو بھی بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور مختلف مطابع نے شائع کیا راقم کے پیش نظر ۱۸۹۴ء کا یہ ایڈیشن ہے جسے مطبع نامی لکھنؤ نے شائع کیا شہیدی کی شاعری کا اکثر حصہ مجازی حالات و کوائف اور رومانی تصورات و خیالات پر مشتمل ہے ان کی تغزل پسندی کا سلسلہ دراز نظر آتا ہے انہوں نے اپنے محبوب اور اپنے وارداتِ قلبی کو ہر زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سوز و گداز رنج و کرب، ناز و ادا، حسرت و یاس کی ہر جگہ جلوہ آرائی ہے لیکن اس انداز تغزل کے باوجود لطیف و سنجیدہ اور روحانی تخیلات کی چمک سے ان کا دیوان محروم نہیں ہے دیوان شہیدی میں اگرچہ نعتیہ کلام کی کثرت نہیں ہے پھر بھی ان کے ایسے تھوڑے ہی کلام نے دنیائے شاعری میں جو انقلاب اجاگر کیا ہے وہ شہیدی کی شاعری کا عظیم کارنامہ ہے۔

ابتدائی دور کے اعتبار سے انہوں نے اپنی نعتیہ غزلوں اور قصیدوں میں جن جدید ہیئتی تجربوں کا اضافہ کیا ہے اس کی مسلّم حیثیت نے بعد کو نعتیہ شاعری کے لئے بہت سے دروازے کھول دیئے ہیں چنانچہ دیوان شہیدی کا پہلا غزل نما نعتیہ قصیدہ جسکا مطلع ہے ۔

رقم پیدا کیا کیا طرفہ بسم اللہ کی مد کا　　سر دیوان لکھا میں نے مطلع نعت احمد کا

اس بلیغ و معیاری قصیدے نے گویا شہیدی کو حیات جاوداں عطا کر دی نہ صرف اعلیٰ فکر و فن اور انفرادی طرز و اسلوب کا حامل ہے بلکہ پورا قصیدہ عشق رسالت کا آئینہ دار اور جذبۂ والہانہ کا مظہر معلوم ہوتا ہے شہیدی کا دل حب رسالت مآب سے معمور تھا اور ان کے جذبات و احساسات میں غضب کی حلاوت و توانائی تھی۔ ؎

خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے
زباں پر میرے جس دم نام آتا ہے محمد کا

حضرت شاہ اکبر داناپوری لکھتے ہیں: "ہندوستان میں بھی حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق بہت ہوئے ہیں جن کو میں نے دیکھا ہے یا میرے زمانے کے ہیں اونکا ذکر کرتا ہوں۔ کرامت علی شہیدی بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ہندیوں میں یہ شخص بھی بے مثل ہوا ہے اس نے نعتیہ قصیدہ لکھا ہے اس کا اب تک اثر باقی ہے اور باقی رہے گا اس کا جواب تو بہت لوگوں نے لکھا مگر ایک شعر کا بھی جواب نہ ہو سکا۔" (اشرف التواریخ جلد اول صـــ ۲۴۳ مطبع آگرہ اخبار نئی بستی ۱۳۲۲ھ)

اس قصیدے کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس زمین میں بہت سے اساتذہ نے طبع آزمائی کی جن میں فقیر دہلوی، راسخ دہلوی، محسن کاکوروی، امیر مینائی اور عزیز صفی پوری وغیرہم شامل ہیں۔ امیر مینائی حضرت شہیدی کو اس طرز کا موجد تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

کمی اس سے نہیں کی میں نے بھی توصیف احمد میں
شہیدی گو کہ موجد ہے اس آئین مجدد کا

خواجہ محمد شہرت نے اس قصیدے پر ۳۲ خمسے لکھے (دیکھئے مولد شریف بہار

مطبوعہ ۱۲۷۳ھ مطبع نظامی کانپور) اور اس قصیدے کی زمین میں حضرت محسن کاکوروی نے ۱۰۶ خمسے لکھے ہیں۔

دیوان شہیدی میں صرف دو قصیدے ہیں ایک قصیدہ حضرت مولا علی کی شان میں ہے۔ جہاں تک دیگر تفصیلات کا تعلق ہے ان کی ایک دلکش نظم "شب عید" کے عنوان سے ہے جو لطیف جذب و آہنگ اور شوخی و شباب کا مرقع نظر آتی ہے۔ پرانا مقولہ ہے "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" اس مصرع کے تحت "جنازہ نامہ" کے عنوان سے طویل مخمس لکھا ہے یہی روانی انداز ان کی ایک نظم "نامہ" سے بھی واضح ہے جسے انہوں نے اپنے دلبر کے نام لکھا ہے یہ نامہ ۵۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ اسی طرح جامی، جرات عطا اور شاہ نصیر کے کلام پر کل ملا کر ۵۶ خمسے لکھے۔ بسنتی شاعری کی قدیم روایات کی تائید میں ایک بسنتی غزل شہیدی نے بھی کہی ہے جس کا لہجہ ملاحظہ کیجئے۔

غضب ہے ہجر میں جس کے رہیں نہ بھائے بسنت
وہ بر میں غیر کی بیٹھا ہوا منائے بسنت
کہے ہے دیکھ مرے رنگ زرد کو وہ شوخ
شہیدی آج تو تم بھی مناکے آئے بسنت

شہیدی کے دیوان میں دو سو سے زائد غزلیں ہیں بعض غزلیں انتہائی سنگلاخ زمینوں میں بھی ہیں جن سے ان کی استادانہ مہارت و مشاقی کا نمایاں ثبوت ملتا ہے اس کے علاوہ سنجیدہ اور باوقار فکری تسلسل کی بنیاد پر ان کی شاعری تکلفات و تصنع اور آورد سے دور نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب نے اپنے مضمون "کرامت علی خاں شہیدی" (مطبوعہ معارف جنوری ۱۹۶۴ء) میں ایک نعت جس کا

مطلع ہے ؎

ان کے رخ صبیح پہ زلفیں ہیں مشک فام دو
قدرتِ حق کو دیکھئے ایک سحر ہے شام دو

اس کو کرامت علی شہیدی کی بتائی ہے جب کہ یہ نعت مولانا غلام امام شہید کے نعتیہ مجموعہ میں موجود ہے اس کے علاوہ "گلدستہ عطار حصہ دوم صفحہ ۱۱۹ مطبوعہ ۲۶ جنوری ۱۹۰۹ء مطبع ابوالعلائی آگرہ" میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس نعت کا مقطع یہ ہے۔ ؎

آج شہید بے نوا پڑھتا ہے نعت مصطفےٰ
جمع ہوں خاص و عام دو سب کو یہی پیام دو

نمونۂ کلام

(۱)

میں معتقد ہوں عشق خوش عندلیب کا — کہتے ہیں گل عرق ہے خدا کے حبیب کا
کب سنبل بہشت معطر کرے دماغ — گر بو پہنچے نفع اسکے نہ گیسو کی طیب کا
دے عقل کل کو طفل دبستاں جہاں سبق — اس مدرسہ میں تجھ کو لقب ہے ادیب کا
گر دل پہ عشرت شب معراج کا نشاں — اب تک حنا میں ہاتھ ہے کف الخضیب کا
آوازہ بجتے رہے داؤد عمر بھر — اس آرزو میں کام ہے اس بے نقیب کا
فرخندہ بخت ہے وہ جو امت بنے تری — ارماں پیمبروں کو رہا اس نصیب کا
کہیے ہدایت اس کو خدا سے ملا دیا — رستہ دکھا دیا ہمیں ایسا قریب کا
دنیا میں نام کو نہ رہا کفر کا مرض — دھو دھو کے اڑا دیجیے ایسے طبیب کا
صدقہ حسن حسین کا اس وقت یا رسول،

ہونا شفیع اپنے شہیدؔی غریب کا

(۲)

ہے سورۂ والشمس اگر روئے محمد
واللیل کی تفسیر ہوئی موئے محمد

جب روئے محمد کی نظر آئی تجلی
سمجھا میں شب قدر ہے گیسوئے محمد

کم ساتھ ہوا روئے نکو خوئے نکو کا
ہے نیک مگر روئے صفت خوئے محمد

ہے سرمۂ کوری میں نہاں دیدۂ بد میں
جس دن سے عیاں ہے رخ نیکوئے محمد

ماہ نو شوال سے عاشق کو نہیں عید
جب تک نظر آجائے نہ ابروئے محمد

کس وضع اٹھائے ہوئے ہیں بار دو عالم
ظاہر میں تو نازک سے ہیں بازوئے محمد

تھا بیش بہا حسن کے بازار میں یوسف
پر ہو نہ سکا سنگ ترازوئے محمد

گلگشت گلستاں میں پڑھو صل علیٰ تم
ہر پھول کی بو میں ہے رچی بوئے محمد

کعبہ کی طرف منہ ہو نمازوں میں ہمارا
کعبہ کا شب و روز ہے منہ سوئے محمد

ہر نخل بیابان عرب مجھ کو ہے طوبیٰ
ہوں شیفتۂ قامت دلجوئے محمد

رضواں کے لئے لے چلو سوغات شہیدؔی
گر ہاتھ لگے خار و خس کوئے محمد

(۳)

رقم پیدا کیا کیا طرفہ بسم اللہ کی مد کا
سر دیوان لکھا ہے میں نے مطلع نعت احمد کا

طلوع روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا
ظہور حق کی حجت ہے جہاں میں نور احمد کا

دبستان ازل میں وہ معلم عقل کل کا تھا
نہ تھا نام و نشاں جن روز دن اوس لوح زبرجد کا

یہ چمن پیرائے کن فراش اوسکی بزم رنگیں ہیں
بہار آفرینش ایک بوٹا اوس کی مسند کا
عجم میں زلزلہ نوشیرواں کے قصر میں آیا
عرب میں غل ہوا جس وقت اوکی آمد آمد کا
شرف حاصل ہوا آدم اور ابراہیم کو اس سے
نہ تنہا فخر عالم فخر تھا اپنے اب وجد کا
شب و روز اونکے صاحبزادوں کا گہوارہ جنباں تھا
عجب ڈھب یاد تھا روح الامیں کو بھی خوشامد کا
وہ اس عالم میں رونق بخش تھا جو زینتی تکیں کو
کیا جنت میں طوبیٰ بنکے سایہ اوس سہی قد کا
رواں تسنیم و کوثر ایک قطرہ آب سے اوسکے
کروں کیا وصف اوس در یتیم بحر سرمد کا
شب معراج چڑھ کر عرش سے دم میں اوتر آیا
بیاں اُس قلزم معنی کا ہو کیا جزر اور مد کا
کشا دہ عقدۂ باطن ہیں کافی نام حق اوس کو
کھلا کرتا ہے بن کنجی ہمیشہ قفل ابجد کا
وفات ظاہری سے جوہر جاں میں نہ فرق آیا
وہ جسم پاک کو محسود تھا روح مجرد کا
گرا فعی بن کے ہاں نکلے اودھر ابلیس اندھا ہو
ملا ہے قصر اخضر روح کو اوسکی زمرد کا
اودھر اللہ سے واصل اودھر مخلوق سے شامل

خواص اد میں بہ نرخ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا
نہ کم قدر ہو سکی شیرازہ بکھر جائے ارکاں کے
نہ افزوں رتبۂ قرآں معجزا سے مجلد کا
گذر وحدت سے کثرت میں نہ ہوتا ذاتِ مطلق کو
نہ بنتا صفر گر نقش احد پر میم احمد کا
بھروسا ہر کسی کو اک حصارِ عافیت کا ہو
مجھے نام مبارک کا ہے ذوالقرنین کے سد کا
ترے پابوس سے ہفتم فلک پر منزلِ کیواں
ترے سجدے میں ہشتم آسماں پر فرقِ فرقد کا
خدا بن مانگے کیا کیا نعمتیں دیتا ہے بندوں کو
ترا دستِ دعا ضامن ہے جیسے کل کے مقصد کا
بٹیں گے جس گھڑی عشرت کے ساماں بزمِ جنت میں
کھلے گا حال امت کو ترے انعامِ بے حد کا
رہا کعبے میں تیرے روضے کے در پر نہ جا پائی
اسی اندوہ سے ہے رنگ تیرہ سنگِ اسود کا
نشانہ تادر انداز قد کا دست و بازو ہو
تری خواہش کرے تیر قضا کو حکم گرد کا
لب گوہر فشاں وا ہوں گے جب عرضِ شفاعت کو
تماشا گاہِ محشر میں تکیں گے نیک مُنہ بد کا
عدو کو حشر تک انکار ہو تیری رسالت میں
محل باقی رہے اللہ کے قولِ مؤکد کا

ہوا تجھ سا نہ ہو سکتا ہے میرا ہے یہی ایماں
نہ مانوں مسئلہ ہرگز کسی زندیق و مرتد کا
تری تعریف سے میری زباں میں آئی ہے تیزی
صفاہاں تک مسخر ہوگا تیغ ہند کا
پھٹیں گے مثل تقویم کہن دیواں ہزاروں کے
ہوا عالم میں شہرہ میرے اشعار مجید کا
ہوئی ہے ہمت عالی مری معراج کی طالب
میسر ہو طواف اے کاش مجھ کو تیری مرقد کا
کبھی نزدیک جا کر آستانے پر ملوں آنکھیں
کبھی گر دور بیٹھوں میں کروں نظارہ گنبد کا
فراغ دل سے گر واں زندگی کا کوئی دم گذرے
حسد ہو خضر و عیسیٰ کو مرے عیش مخلد کا
مدینے کی زمیں کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ
کسی صحرا میں واں کے طعمہ ہوں میں دام اور دد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا
خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدیؔ کس محبت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمد کا

سید کفایت علیؔ کافی مرادآبادی

نام سید کفایت علی، تخلص کافی، مقام نگینہ ضلع بجنور کے خانوادہ
سادات سے تھے برگزیدہ علماء میں شمار ہوتا ہے مرادآباد کے قدیم باشندہ تھے
مگر ان کا اظہار ایک دوسرے جذبہ کی روشنی میں کیا ہے

چل مدینہ طیبہ کو چھوڑ کر شہر وطن
اس مرادآباد سے کافی کہاں کا ارتباط

ابتدائی تعلیم مرادآباد میں حاصل کی اعلیٰ تعلیم علماء بریلی و بدایوں سے حاصل
کی اور شاہ ابوسعید مجددی رامپوری تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے
علم حدیث پڑھا۔ شاہ غلام علی نقشبندی دہلوی نے خلافت سے نوازا اور علم طب
مؤلف "تذکرۂ علمائے ہند کے والد ماجد حکیم شیر علی قادری سے حاصل کیا اور
مہارت پائی اپنے استاد حکیم شیر علی خاں قادری کی وفات پر مولانا کافی نے
قطعہ تاریخ وفات لکھا۔

تو شیر علی نے کیا انتقال	تو کافی مناسب ہے بہر ثواب
یہی سال تاریخ لکھ دیجئے	یہ لوح لحد خادم بوتراب ۱۲۵۶ھ

مولانا کافی اپنے وقت کے جید عالم دین اور فقیہہ تھے مولانا کو علوم نقلیہ
وعقلیہ میں کمال حاصل تھا خصوصاً صرف ونحو، ادب وعروض اور علم طب میں
اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ تاریخ گوئی کے بھی ماہر تھے مولانا کافی ایک سچے عاشق رسول

ہونے کے سبب زیارت حرمین شریفین کے لئے ہمیشہ بیتاب رہتے اور اپنے دل کی پیاس بجھانے کے لئے ہر دم تڑپتے رہتے جس کا اظہار انھوں نے والہانہ پن کے ساتھ اپنے اشعار میں کیا ہے۔

دکھادے جلوۂ طیب دکھادے روضۂ اقدس
دکھادے گنبد خضریٰ کہ تسکین دل و جاں ہو
دکھادے وہ بھی دن یارب کہ حاضر ہوکے یہ کافی
جناب مصطفےٰ کے آستانے پر غزل خواں ہو

ہے مدینے کی زیارت کا جو کافی مشتاق
یہ ارادہ مرا یارب کبھی پورا ہوگا؟

اللہ رے ان آنکھوں کی یہ ہے ہمیں تمنا   دکھلائے مدینہ ہمیں دکھلائے مدینہ
کافی یہ تمنائے دلی ہے کہ دم مرگ   گر آہ یوں کھینچوں تو کہوں ہائے مدینہ

مولانا کافی کی یہ تمنائے دلی پوری ہوئی اور نہ زیارت حرمین شریفین سے مستفیض ہوئے۔

ماہر علوم و فنون کے علاوہ آپ کی مجاہدانہ حیثیت بھی صفحات تاریخ پر روشن ہے بے شمار علماء کرام کے ساتھ تحریک جنگ آزادی میں آپ بھی شریک ہوئے اور ہمت و استقلال اور جواں مردی کا بے لوث مظاہرہ کیا علامہ فضل حق خیر آبادی کی طرح جہاد کی نشر و اشاعت میں آپ کا بھی خصوصی ہاتھ رہا اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد صادر فرما کر عام کیا۔ ایک سرگرم عمل رکن کی حیثیت سے روہیل کھنڈ کے اضلاع میں

تبلیغی دورے کرنے کے بعد آپ جنرل بخت خاں کی فوج کے ہمراہ مرادآباد پہونچے اور یہاں بھی گوروں کے خلاف اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا چنانچہ مرادآباد پر قبضہ ہونے کے بعد آپ ہی امیر شریعت بنائے گئے پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء میں مجاہدوں کو شکست ہوئی گرفتاریاں ہوئیں۔ خانہ تلاشی ہوئی اسی خانہ تلاشی کے دوران فخرالدین کلاں کی مخبری پر مولانا کافی بھی گرفتار ہوئے مقدمہ قائم ہوا اور پھانسی کی سزا تجویز کی گئی پھانسی کی اطلاع پاکر بہت مسرور ہوئے۔ چہرے سے کسی خوف وہراس کا اظہار نہ ہوا اور نہ ہی آنکھوں کی مجاہدانہ چمک میں کوئی کمی آئی چنانچہ ۲۷ رمضان المبارک کی مقدس تاریخ تھی جمعرات کا دن تھا اور عصر کا وقت مرادآباد کے ایک چوراہے پر روزے کی حالت میں جب آپ کو تختۂ دار پر لایا گیا تو آپ بڑے اطمینان سے باآواز بلند بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہدیۂ عقیدت پیش کر رہے تھے جس کا مطلع ہے ؎

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

حمید راعی ایم اے اپنے مضمون "۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور علماء حق" میں لکھتے ہیں۔ "شہادت کے تقریباً ۵۳ سال بعد مولانا کی قبر جو کہ جیل کے پاس واقع تھی سڑک پر آگئی تھی جس سے قبر مبارک کھل گئی اور دیکھنے والوں نے دیکھا جسم ویسا ہی رکھا تھا پھر جسم مبارک کو دوسری جگہ عقب جیل میں دفن کر دیا گیا۔ (ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڈھ شمارہ فروری ۱۹۸۲ء)

مگر مولانا امداد صابری کے حوالہ کے مطابق جسم مبارک کو کسی دوسری جگہ

منتقل نہیں کیا گیا وہ لکھتے ہیں " مولانا محمد عمر صاحب نعیمی کی روایت میں یہ صحیح نہیں ہے کہ مولانا کافی کا جسم مبارک مولوی محمد عمر صاحب کے نانا کرامت علی ٹھیکیدار نے دوسری جگہ دفن کرایا تھا صحیح واقعہ بقول مولوی ظفرالدین صاحب مرادآبادی خلیفہ مولوی نعیم الدین مرحوم یہ ہے کہ ایک سڑک بدھ کے بازار سے نکالی جارہی تھی مولانا کافی کے مزار کا نشان نمایاں نہیں تھا مزدور نے جب اس پر پھاوڑا چلایا تو مولانا کافی کی پنڈلی پر لگا اور وہ نظر آئی مزدور نے انگریز انجنیئر سے کہا اس نے احتراماً فوراً اس قبر کو درست کرا دیا اور سڑک کا رخ بدل دیا جس کی وجہ سے سڑک پر ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے۔ مولانا کافی کی قبر کنجری سرائے مویشی خانے کے سامنے ہے اسی قبر میں جسم مبارک ہے منتقل نہیں ہوا (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء ص ۳۱۸ مطبوعہ دہلی ۱۹۵۹ء)

مولانا سید کفایت علی کافی مرادآباد کے برگزیدہ علماء و شعراء اور مجاہدین آزادی میں سے تھے شاعری میں مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی تلمیذ حضرت ناسخ کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ نعت گوئی کے فروغ وارتقاء میں آپ نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں بڑے ہی اعلیٰ وارفع مقام کے مالک ہیں۔ حضرت شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ نے آپ کے نعتیہ فکر و فن اور انداز بیان کو بے حد سراہا ہے اس سے زیادہ مستند ثبوت اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے حضرت کافی کے والہانہ جذبات بے ساختہ اظہار اور دردِ دل کی کیفیات سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں۔

پروازیں جب حدیث شہ میں آؤں　　تا عرش پرواز فکر رسا میں جاؤں

مضمون کی بندش تو میسر ہے رضا　　کافی کا دردِ دل کہاں سے لاؤں

ایک دوسری رباعی میں فاضل بریلوی نے حضرت کافی کی شعری عظمت کا

اعتراف کرتے ہوئے "سلطان نعت گویاں" سے تعبیر فرمایا ہے۔ کہتے ہیں :

مہکا ہے مرے بوئے دہن سے عالم — ہاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے ہم
کافی سلطانِ نعت گویاں ہے رضا — انشاء اللہ میں وزیر اعظم

"الملفوظ حصہ دوم میں حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں" مولانا کافی اور حسن میاں مرحوم کا کلام اول سے آخر تک شریعت کے دائرے میں ہے"۔ کہا گیا ہے کہ نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ بڑے بڑے ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اسی لئے فاضل بریلوی نے اس اہمیت و ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پاس رعایت عشق، احتیاط و پابندی اور قیود و شرائط کی روشنی۔۔ں حضرت کافی اور حضرت حسن کی نعتیہ شاعری بھی عیوب و اغلاط سے پاک ہے اور عشق رسالت کی سچی ترجمان ہے۔

حضرت کافی صاحب علم و فضل اور صاحب زہد و ورع تھے۔ ایک سچے دیوانہ رسول تھے۔ حمد و نعت کے سوا اور کچھ نہ کہا۔ ساری شاعری جذبات حقیقی اور حقیقت پرستی کی ترجمان و امین ہے۔ نعتیہ غزل کے ابتدائی سلکوں میں آپ کا نام انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اصحاب علم و ادب بڑی عقیدت سے آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ دیوان کافی کے علاوہ احادیث کے تراجم یا اس کی شرح کے طور پر آپ کی کئی نظمیں ہیں۔ چہل احادیث کا ترجمہ، نسیم جنت، شمائل ترمذی کا ترجمہ، بہار خلد اور حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی کا رسالہ ترغیب اہل سعادت کا ترجمہ خیابان فردوس ہے۔ مولد شریف بہاریہ مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۲۷۳ھ حضرت کافی کا دیوان ہے جس میں مذکورہ نظمیں نسیم جنت، بہار خلد اور خیابان فردوس شامل نہیں ہیں۔ دیوان کافی میں مثنویوں کی تعداد زیادہ ہے جیسے مثنوی داستانِ صادقاں، مثنوی قصہ بست اصحاب، مثنوی جذبۂ عشق، وفات نامہ اور مثنوی

مثنوی تحمل دربار نبی کریم " حضرت کافی کو مثنوی گوئی پر ملکہ حاصل تھا عشق ومحبت اور فکر ونظر کی روشنی میں ڈوبی ہوئی ان کی بعض مثنویاں اردو شاعری میں بہترین اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کے دیوان میں اگر مثنویوں کی تعداد زیادہ ہے تاہم مولد شریف بہاریہ میں شامل چند غزلوں کی فکری وفنی بلندیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس طور پر بھی کہ اردو نعتیہ غزلوں کے ابتدائی دور کے یہی وہ مخصوص فن پارے ہیں جن کی بنیاد پر نعتیہ غزلوں کو بتدریج فروغ حاصل ہوتا رہا۔ غزلوں کا انداز بیاں نہایت سلیس وشستہ اور لطیف ورچبتہ ہے معنی و مفاہیم کے اعتبار سے بھی جامعیت کی پیکر نظر آتی ہیں شعر گوئی میں مہارت و کمال رکھتے تھے البتہ وہ گہرائی اور تہداری کے عناصر بہت کم ہیں جو شہید کی اور شہید کے ہاں ہے تاہم تکمل صحت وسلامتی اور پختہ کاری کے اعتبار سے دیکھا جائے تو حضرت کافی کی غزلوں کی حیثیت مسلّم ہے آپ کے شاگردوں کی خاصی تعداد بتائی جاتی ہے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء کے مصنف نے صرف سید عباس علی عباس خلف سید نادر علی مراد آبادی کا ذکر کیا ہے مولانا عبدالحئ صفا بدایونی کے تذکرہ "شمیم سخن" مولانا عبدالغفور نساخ کے سخن شعرا اور صاحب گلستان بے خزاں میں مولانا کافی کے علم وفضل، مجاہدانہ کردار اور شعری عظمت پر تبصرے قابل قدر ہیں۔

نمونۂ کلام

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا

پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

ہمسفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا

بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بیجان پر خاکی کفن رہ جائے گا
ہم فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

اوس رخِ پاک کا جس بزم میں چرچا ہوگا
درود یوار سے واں نور برستا ہوگا
کیوں نہ ہو غیرتِ برگِ شجرِ طور زباں
جب مرے منہ میں ترا وصف سراپا ہوگا
حبذا صاف جبیں صلِ علیٰ پیشانی
شعلۂ طور خجل دیکھ یہ ماتھا ہوگا
اوس قدِ پاک کے سایہ کا بندھا ہے جو خیال
اخترِ بخت عدم میں مرا چمکا ہوگا
ماہِ نو عیدِ شفاعت کا چمک جاوے گا
جس طرف حشر میں ابرو کا اشارہ ہوگا
شانِ محبوبی سے جب آپ نکل آئیں گے
رشکِ صحنِ چمن حشر کا عرصہ ہوگا
جائیں گے سوئے چمن کنجِ قفس سے چھٹ کر
اپنی قسمت میں کوئی اور بھی ایسا ہوگا
ہمصفیرو مرا احوال بھی کہلا بھیجو
کوئی زوار مدینے کو بھی جاتا ہوگا
ہے مدینے کی زیارت کا جو کافی مشتاق
یہ ارادہ مرا یارب کبھی پورا ہوگا

عرش بریں ایوانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
خلد سرا بستانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
آپ کفیل کل امت آپ شفیع روز قیامت
ہیں بے حد احسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہیں وہ شفیع روزِ محشر ہیں وہ قسیم حوض کوثر
سب کچھ ہے شایان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

باعث حسن جن و بشر ہے موجب نور شمس و قمر ہے
مہر رخ تابان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آدم اور سلیماں، موسیٰ اور فلک چوتھے پر عیسیٰ
ہیں مہمانِ خوان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مظہر رحمت مصدر رافت مخزن شفقت عین عنایت
ذات محمد، جان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

جان مری کیا جان جہاں کی اور بہاریں باغ جناں کی
کیجیے سب قربان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بہر شفائے درد و مصیبت اور برائے رنج و فلاکت
کافی ہے درمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اون کے ناخن پر فدا جاں کیجیے
اور ماہ عید قرباں کیجیے

جان کیا ہے اور ماہ عید کیا
یاں فدا ملک سلیماں کیجیے

اون کے ناخن کا تراشا گر ملے
جیب جاں میں اسکو پنہاں کیجیے

اور روز حشر ہو جب آشکار
پیش او سکو پیش یزداں کیجیے

صحن محشر عید گاہ مغفرت
از برائے اہل عصیاں کیجیے

صاحب لولاک کی امت ہیں ہم
آج ہم پر بذل غفراں کیجیے

تجھ کو لکھنا ہے سراپائے نبی
کافی مدارح ساماں کیجیے

واہ کیا جلوۂ رندان ہے سبحان اللہ
کیا تبسم کا یہ سامان ہے سبحان اللہ

محو دیدار فرشتوں کو کیا گردوں پر
کیا ہی محبوبی کی یہ شان ہے سبحان اللہ

ہے وہ سیمائے مبارک کہ تجلی جس سے
رونق روضۂ رضوان ہے سبحان اللہ

حسن وہ حسن کہ جس حسن کا عاشق ہے خدا
وصف اوس حسن کا قرآن ہے سبحان اللہ

نور ذات نبوی صلی علیٰ اے کانی
آیت رحمت رحمان ہے سبحان اللہ

مصنف کی دیگر مطبوعہ تصانیف

(۱) ارتعاش — شعری مجموعہ

(۲) ب ر لہجہ (انعام یافتہ) — "

(۳) رقص تحریر — طنز و مزاح

(۴) شہ رگ — "

(۵) نکاح کی اہمیت — احکام و فضائل

— (غیر مطبوعہ تصانیف) —

۱- تذکرہ سید عبدالرشید عظیم آبادی ۲ نئی ادبی تحریکات کی رفتار۔
۳- "آبگینے" (نعت و منقبت)

لطف علی خاں لطفؔ بریلوی

تلاش بسیار کے باوجود راقم حقیر کو عاشق رسول حضرت لطف علی خاں لطفؔ بریلوی کے تفصیلی حالات و کوائف معلوم نہ ہو سکے بس مختصر تذکرے سوا اور کچھ ملتا نہیں۔ اتنے عظیم اور صاحب دیوان شاعر نعت کو بھلائے رکھنا حیرت انگیز ہے۔ خادم صنف نعت ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیبؔ بریلوی نے اپنی تصنیف تذکرۂ نعت گویان بریلی (مطبوعہ بریلی ۱۹۸۶ء) میں کچھ اہم حالات و حقائق درج کئے ہیں جو حضرت لطف کے بھتیجا مولوی لیاقت علی خاں ساکن محلہ قلعہ بریلی (متوفی ۱۹۷۵ء) کی زبانی حاصل ہوئے۔ راقم یہاں اسکی پوری عبارت نقل کرتا ہے۔

"نام لطف علی خاں، والد کا نام حسن علی خاں جو بڑے زمیندار تھے ساکن محلہ کسگراں بریلی باعمل اور صوفی منش بزرگ تھے تمام عمر صرف نعت لکھی۔ نعتیہ شاعری دو دواوین پر مشتمل تھی۔ ایک دیوان ضائع ہو گیا۔ ایک دیوان جو محفوظ رہا مطبع آئینۂ سکندری میں ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء کو شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء اور تیسرا ایڈیشن ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء کو شائع ہوا۔ اس دیوان میں نعتیہ غزلیات، ایک مخمس، ایک مسدس اور ایک تضمین ہے شاعری میں بریلی کے مشہور نعت گو سید احسان علی احسنؔ کے شاگرد تھے۔ لطف کو شمالی ہند کے مشاہیر نعت گویاں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولف شعراء ہند (جلد دوم) نے نعتیہ شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے ان کا تذکرہ کرامت علی خاں شہیدی اور مولوی غلام امام شہید کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے باوصف کہ بریلی کے شعراء پر لکھنوی طرز شاعری کے اثرات پڑنا شروع ہو گئے تھے لطف ان اثرات سے محفوظ رہے انھوں نے سادہ سلیس اور بامحاورہ زبان میں سامنے کے مضامین نعت قلمبند کیے جو دراصل ان کی ادبی بقا سے عبارت ہیں۔

جہاں تک نعتیہ شاعری کا تعلق ہے لطف علی خاں لطف کو بریلی کی نعتیہ شاعری کا بادا آدم کہا جاتا ہے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ (تذکرہ نعت گویان بریلی صہ ۱۱۳ سنہ ۱۹۸۶ء)

مولانا غلام امام شہید کے ہم عصروں میں مولانا شہید کے بعد حضرت لطف کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کے نعت گویوں میں صرف حضرت لطف ہی ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے بڑی خصوصیت کے ساتھ نعتیہ غزل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ نعتیہ غزلیں کہنے کا شرف حاصل کرتے ہوئے باقاعدہ دو ضخیم دیوان ترتیب دیئے افسوس کہ ایک دیوان ضائع ہو گیا۔ موجودہ دیوان ان کی عظیم شعری خدمات کی قابل فخر یادگار ہے۔ اپنے زمانے میں دیوان لطف کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور میلاد شہید کی طرح اس کو بھی متعدد مطابع نے شائع کیے۔ مطبع آئینۂ سکندر کے علاوہ مطبع نظامی کانپور ۱۲۷۹ھ، مطبع شعلۂ طور کانپور سنہ ۱۲۸۰ھ اور مطبع احمدی لکھنؤ ۱۳۰۱ھ کے ایڈیشن بھی نظر آتے ہیں ممکن ہے اور دیگر مطابع نے بھی اس کو شائع کیا ہو۔ لطف کے دیوان میں مناجات، مسدس، مخمس اور ایک معراج نامہ کے علاوہ سب غزلیں ہی غزلیں ہیں پورا دیوان حروف تہجی

کے اعتبار سے ترتیب یافتہ ہے ۔ سراپائے رسول اور محفل میلاد کی عظمت وفضیلت سے متعلق بہ ہیئت غزل دو طویل نظمیں بھی زینت دیوان ہیں ۔

حضرت لطفؔ ایک سچے دیوانۂ حبیب اور مداح رسول تھے جو کچھ کہا بارگاہ رسالت مآب کی شان میں کہا، دیوانہ وار کہا، مچل کر کہا، آہ بھر کر کہا اور آنسو بہا کر کہا۔ لطفؔ کی شاعری کو اگرچہ حضرت شہیدؔ اور مولانا کافیؔ کے معیار کے برابر تو نہیں رکھا جا سکتا تاہم دل کی تڑپ، جذبات کی صداقت اور احساس کی شدت ان کی شاعری کے خصوصی وصف کو واضح کرتی ہے فکروں میں وسعت، گہرائی اور پھیلاؤ کم ہونے کے باوجود بھی ان کے اشعار کی سلاست و روانی، سادگی اور بے ساختہ پن اپنی جانب کھینچنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے حضرت لطفؔ تخیلات و افکار کی بندش بڑے سیدھے پیرائے میں کرتے ہیں اور گہری فکروں کی جانب کم توجہ دیتے ہیں تو اردو خیال کے پیش نظر اگر غور کیا جائے تو ان کے دیوان میں ثنائے حبیب، اظہار معصیت اور تمنائے بخشش جیسے موضوعات پر اگرچہ بیشتر اشعار نظر آتے ہیں مگر ان کی کیفیت دلنشینی و دلآویزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شہیدؔ کی طرح آپ بھی میلاد خوانی اور محفل میلاد کے دیوانے تھے ۔ اس کی فضیلت و برکت اور عظمت سے متعلق دو حصوں پر مشتمل ان کی طویل نظم عشق رسالت کا پیغام دیتی ہے ۔

مومنو جمع الجوامع میں لکھا ہے دیکھ لو
ہوتے ہیں حضرت بھی شامل محفل میلاد میں
لطفؔ پائے گا خدا سے باغ جنت مانگیو
پڑھ کے حضرت کے فضائل محفل میلاد میں

لطف کیا بیٹھا ہے غافل محفل میلاد میں
ہیں رسول اللہ شامل محفل میلاد میں

نعت گوئی کو تلوار کی دھار پر چلنے سے زیادہ دشوار صرف اسی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ اس راہ میں بہت سنبھال سنبھال کر قدم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بے شمار نزاکتوں اور پہلوؤں پر بڑی گہری نظر رکھنا پڑتی ہے دیوان لطف میں ایسے کئی اشعار قابل گرفت اور قابل اعتراض بھی دکھائی دے جاتے ہیں جو اپنے متضاد بیانات کے تحت شاعر کی بے احتیاطی کا پتہ دینے لگتے ہیں۔
اسی طرح ان کے چند اشعار فضول مبالغہ آرائی کی نذر بھی ہو گئے ہیں انھوں نے اپنے چند اشعار میں لفظ یثرب بھی استعمال کیا ہے جبکہ حکم رسول خدا کے بعد اس لفظ کا بولنا اور لکھنا دونوں ممنوع ہے ویسے ایک عاشق رسول کی ان چند غلطیوں کو اس کے سہو نظر اور بے خیالی ہی کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔
وگرنہ ان عیوب کے علاوہ لطفؔ کا سارا دیوان عشق و محبت، حسن وعقیدت اور والہانہ جذبات واحساسات کا قیمتی مرقع ہے اپنے عہد میں ان سے زیادہ نعتیہ غزلیں شاید ہی کسی شاعر نے کہی ہوں۔ اس لحاظ سے بھی لطفؔ کی شعری خدمات کو سرخ روئی حاصل ہے۔

نعت رسولؐ میں کوئی دیواں لکھوائے لطفؔ
تا خلق یاد کرتی رہے مرحبا کے ساتھ

حفیظ تائب لکھتے ہیں" انھوں نے (لطف نے) غزل کو نعت کے لئے مخصوص کر کے نعت گوئی کے وسیع امکانات دریافت کئے اور اپنے فکر و فن کو نعتیہ غزل کے لئے وقف رکھا۔ (نقوش کا رسول نمبر جلد ۱۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء)

نمونۂ کلام

عشق میں لطف جو تو اوس سے نہ کمتر ہوتا
تیرا مرقد بھی شہیدی کے برابر ہوتا
عفو ہوتی نہ کسی طرح خطائے آدم
تو نہ حامی اگر اے شافع محشر ہوتا
راستہ خلد کا ملتا نہ گنہگاروں کو
بخدا تم سا پیمبر جو نہ رہبر ہوتا
تیرے دیدار کی امید نہ ہوتی جو مجھے
گو رمیں میرا گذارا نہیں دم بھر ہوتا
اونکی نعلین مبارک پہ تصدق کرتا
زر زمانے کا اگر مجھ کو میسّر ہوتا
چومتے جاتے آنکھوں سے لگاتے اوسکو
گر میسّر درِ محبوب کا پتھر ہوتا
لطف الطاف خدا ہوتا ہے جس شاعر پر
بخدا ہے وہی مداح پیمبر ہوتا

---

(۲)

عشق محبوب خدا اے دل جسے حاصل نہیں
لاکھ مومن ہو مگر ایمان میں کامل نہیں
روح جنت کو نہ جائے گی مدینہ سے مری

ہوں میں شیدائے نبی حوروں پہ کچھ مائل نہیں
کر مجھے سیراب دیدار رسول پاک سے
آب کوثر کا خداوندا میں کچھ سائل نہیں
جان آسانی سے نکلے وقت مردن یا نبی
آپ کے نزدیک یہ مشکل مری مشکل نہیں
نشۂ عشق نبی نے یہ بنایا مجھ کو مست
یاد حق سے ایک دم بھی دل مرا غافل نہیں
پھرتی ہے آنکھوں میں میری صورت پاک نبی
لطف مجھ سا والضحیٰ کا خلق میں عامل نہیں

(۳)

بلبل سے فزوں تر ہے تمنائے مدینہ
کیا غیرت گلزار ہے صحرائے مدینہ
دکھلائے مدینہ مجھے مولائے مدینہ
مر جاؤں گا کہہ کہہ کے نہیں ہائے مدینہ
گویا ہے زباں بہر سخن ہائے مدینہ
روشن ہے نظر بہر تجلائے مدینہ
حضرت انہیں دیتے ہیں نشاں راہ کا آکر
جو وقت بھٹک جاتے ہیں جویائے مدینہ
ہے نور محمد سے زمیں مہر جہاں تاب
اور خط شعاعی ہیں شجر ہائے مدینہ
ہے گوشے سے کم شش جہت گلشن ارم کا
کیا عرض کروں وسعت صحرائے مدینہ
ہے خار بہار آنکھوں میں گلزار ارم کے
پھرتا ہے نظر میں مری صحرائے مدینہ
کیا گلشن ایجاد ہے دیکھوں نہ سوئے خلد
ہاتھ آئے اگر دامن صحرائے مدینہ
اے لطف یہ خواہش یہ تمنا یہ ہوس ہے
لے جاؤں نہ دنیا سے تمنائے مدینہ

(۴)

یوں انبیاء ہیں میرے پیمبر کے سامنے

تارے ہوں جس طرح مہِ انور کے سامنے
زاہد کو قصرِ خلد مبارک ہو یا نبیؐ
بستر فقیر کا ہو ترے گھر کے سامنے
دیکھا ہے جس نے قامتِ حضرت وہ کہتا ہے
گلشن میں خاک جاؤں صنوبر کے سامنے
جس مردے کو نہ حضرتِ عیسیٰ جلا سکیں
لے آؤ اوس کو میرے پیمبر کے سامنے
کچھ تو سمجھ لیا ہے جو دل سے اٹھا کے ہاتھ
بیٹھا ہوں سر جھکائے ترے در کے سامنے
اے لطفؔ اس غزل کو مدینہ میں چل کے پڑھ
ہے قدر اس کی صاحبِ جوہر کے سامنے

(۵)

ہم شفیع المذنبیں پر ہو گئے ہیں مبتلا / خوب ہاتھ آیا ہے بخشش کا سہارا ان دنوں
لکھ رہا ہوں میں جو اپنے دل پہ وصفِ خالِ روئے پاک / عرش پر میرا چمکتا ہے ستارا ان دنوں
حلیۂ روئے کتابی اوس کا ازبر ہے مجھے / ہو گیا ہے حفظ قرآں مجھ کو سارا ان دنوں
رات دن عشقِ حبیبِ کبریا سے جلوہ گر / عرش سے کمتر نہیں ہے دل ہمارا ان دنوں
جان کر اوس جانِ جاں کو شافعِ روزِ جزا / خوفِ محشر نے کیا دل سے کنارا ان دنوں
وصفِ ابروئے محمدؐ کا دلا کر لطفؔ شوق
بے اجل تیغِ قضا نے جاں سے مارا ان دنوں

حضرت محسنؔ کاکوروی

حضرت مولوی محمد محسن کاکوروی سید علوی تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت مولا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے ان کے اجداد آستانۂ رسول اللہ و ارض مقدس حجاز سے جدا ہو کر قصبہ صحرام میں آباد ہوئے حضرت قاری محمد صدیق پہلے بزرگ تھے جو ہندوستان تشریف لائے بعدہٗ قاری امیر سیف الدین نے عہد سلطنت سکندر یا ابراہیم لودی میں قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی ان کی اولاد کا وطن مالوف اس وقت تک یہی قصبہ ہے قاری امیر سیف الدین کے باکمال صاحبزادے حضرت مخدوم نظام الدین قاری جامع علوم ظاہر و باطن تھے "صاحبِ تذکرۃ الاصفیا" نے ان کو "امام اعظم ثانی" کے لقب سے یاد کیا ہے حضرت مخدوم سے جناب محسن تک بارہ پشتیں گذریں۔

حضرت محسن ۱۲۴۲ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے سات سال کی عمر سے اپنے جد امجد مولوی حسین بخش شہید (م ۱۲۵۸ھ) کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی ابتدائی تعلیم کا انداز دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بچہ بڑا صاحبِ کمال ہوگا نو سال کی عمر تھی اپنے جد امجد کے پہلو میں سوتے تھے خواب میں زیارت جمال مبارک حضرت محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے۔ اس خواب کا پورا حال حضرت محسن نے فارسی زبان میں تحریر کیا ہے جو ایک مجموعہ قلمی کے صفحۂ اول پر موجود ہے۔ اس خواب کو فارسی میں بھی نظم کیا ہے فرماتے

تھے کہ وہ سب سے پہلی نظم تھی جو اس بتبرک خواب کی روشنی میں میں نے لکھی تھی۔ مولوی حسین بخش مرحوم کے جام شہادت نوش فرمانے کے بعد حضرت محسن اپنے والد ماجد مولوی حسن بخش کے ہمراہ مین پوری میں رہے اور تحصیل علم مولوی عبدالرحیم اور اپنے والد گرامی سے کی مولوی ہادی علی اشک جو ایک زبردست عالم دین اور مسلم الثبوت استاد تھے اپنے ابتدائی کلام پر انھیں سے اصلاح لیا کرتے تھے حضرت اشک کی وفات کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ملازمت و وکالت مین پوری میں چند روز عہدۂ نظارت پر کام کیا۔ خداداد قابلیت سے حکام ضلع رضامند رہے۔ بعض حکام و اکثر احباب کی تحریک سے وکالت ہائیکورٹ کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے میں صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی بعد کامیابی کے آگرہ میں قیام فرمایا منصفی آگرہ میں قانونی لیاقت کا ایسا سکہ بیٹھا تھا کہ ایک مرتبہ صدر دیوانی کے حکام نے بغیر خواہش و استخراج کے متھرا کا منصف مقرر کر دیا حکام کے نزدیک بہت قابل قدر سمجھے جاتے تھے۔ دوسری طرف عالم یہ تھا کہ حضرت مظفر علی شاہ اور حکیم نورالدین کے یہاں رنگین اور پرکیف صحبتیں جو ان کے مذاق طبیعت کے مناسب تھیں اور سوائے آگرہ کے دوسری جگہ ممکن نہ تھیں اس بنا پر ججی و سب ججی کے عہدوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہ گئی اور انھوں نے لشکر گذاری تمام عہدۂ منصفی کے قبول کرنے سے انکار کر دیا دریں اثنا ۱۸۵۷ء کی بھڑکتی ہوئی آگ کا اثر آگرہ تک پہنچا تو اس نے سارا سکون غارت کر دیا کچھ دنوں کے بعد احباب سے مشورہ کرنے پر رخت سفر باندھا اور مع اہل و عیال کاکوری کی جانب روانہ ہو گئے راستے میں بے پناہ پریشانیوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اکیس بائیس روز میں کاکوری پہنچے اور یہاں مستقل قیام کر کے وکالت

آزاد پیشہ کو رونق دی۔ ان کی خوش بیانی، خوبیٔ تحریر، نازک خیالی اور عالی دماغی کو مزید شہرت حاصل ہوئی حکام ان کی تقریر کے ہر ہر لفظ کو بغور سنتے اور عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے حضرت محسن کے صاجزادے جناب نور الحسن اور جناب انوار الحسن کے ایل۔ایل۔بی ہونے کے بعد مقدمات کی پیروی اور کچہری کی آمد و رفت کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا البتہ کبھی کبھی لوگوں کو اپنے نیک مشوروں سے ضرور نواز دیا کرتے تھے انتقال سے تین سال پیشتر مشاغل وکالت اور کاروبار زمینداری سے قطعاً بے تعلقی اختیار کر لی تھی حضرت محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم اکثر مطالعہ میں رہتی تھی اور حصن حصین کا روزانہ ختم پڑھتے تھے۔ حضرت شاہ کرامت علی قلندر سے شرف بیعت حاصل تھا اپنے پیر و مرشد کے عرس میں ہر سال معقول رقم نذر کرتے تھے مندرجہ ذیل حضرات اکثر بغرض اصلاح اپنے کلام بھیجتے رہتے تھے مولوی مولوی محمد احسن، منشی عبد المجید سحر مولوی نعیم، منشی عبد الوحید نیرنگ، مولوی احسن اللہ خاں ثاقب، اور مولوی رضی علی افگر۔

۴ / اپریل ۱۹۰۵ء اسہال کبدی ہو گیا تھا اشتہا بالکل ساقط ہو گئی۔ علاج سے کوئی آرام نہ ملا۔ ۳۲ / اپریل ۱۹۰۵ء کو بعد نماز ظہر ارشاد فرمایا کہ "اب ہمارا آخری وقت ہے تجہیز و تکفین کی تیاری کرو کل کوچ ہے"، ۴۲ / اپریل ۱۹۰۵ء کو علی الصباح پھر ارشاد فرمایا کہ "اب ہمارا کوچ ہے" یہ کہہ کر یاد حق میں مشغول ہوئے پاس انفاس جاری تھا حالت تلقین میں ہر بار بطریق استشہاد اللہ ہو پر انگشت شہادت اٹھاتے تھے اسی حالت میں دس بجے دن کو دار فانی کو خیر باد کہا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ قطعات تاریخ بکثرت لکھے گئے۔ مزار بمقام مین پوری متصل مزار مولوی حسین بخش مرحوم کے ہے۔

(استفادہ بہ کلیات محسن مرتبہ نور الحسن)

لکھنؤ کے دبستان شاعری کی طویل اور تاریخی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے سیکڑوں کی تعداد میں ایک سے ایک استاد فن نے شاعری کی زلفیں سنواریں اور اپنے اپنے مختلف شعری ذوق و میلان کے تحت فکر و فن کو بام عروج پر پہونچایا مگر برسہا برس کی شاعری کے دوران مذہبی رجحان و میلان کو پنپنے کا بہت کم موقعہ ملا اساتذہ سخن اپنے دواوین کا آغاز حمد و نعت یا منقبت سے ضرور کرتے رہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے حمدیہ و نعتیہ اشعار کو ہمیشہ فوقیت دی مگر اس کا سلسلہ دراز کرنے سے ہمیشہ جی چراتے رہے لکھنؤ کی شعری فضاؤں میں نازک خیالی، مبالغہ آرائی، صنعت گری رعائت لفظی، نسوانی عوامل اور مافوق الفطرت جذبات و تصورات نے تو خوب جگہ پائی، بلکہ بازاری اور جھگڑے یا شعری معرکوں نے بھی خوب دلچسپیاں پیدا کیں مگر دہلی دکن بریلی اور آگرہ کی طرح نعت و مناقب کی جانب رجحان بالکل مفقود رہا۔ دہلی، دکن، بریلی اور آگرہ وغیرہ میں تو مذہبی و صوفیانہ شاعری کا پتہ روز اول ہی سے چلتا رہا اور ان مقامات میں ارتقائی صورت حال شروع ہی سے مضبوط ہوتی رہی مگر سرزمین اودھ میں یہ جذبہ کافی بعد میں نمودار ہوا۔ سب سے پہلے مرزا غالب کے عہد میں لکھنؤ میں متعدد شعراء نعتیہ شاعری کے جذبات کو لے کر آگے بڑھے جن میں مجاہد جنگ آزادی مولانا غلام امام شہید کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں اور مستحکم نظر آتی ہے محققین کا کہنا ہے کہ لکھنؤ میں نعتیہ شاعری کی داغ بیل مولانا شہید ہی کی ڈالی ہوئی ہے ویسے اگر مذہبی یا واقعاتی شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو لکھنؤ میں مرثیہ کا رواج کافی پہلے شروع ہو چکا تھا، ضمیر

خلیقؔ، فصیحؔ اور دلگیرؔ وغیرہم کی شاندار ابتدا اور زور دار ارتقا کے بعد انیسؔ اور دبیرؔ نے گویا مرثیہ کو بام عروج پر پہونچا دیا اور اردو شعر و ادب کو ایک عظیم فن کی روشنی سے معمور کیا۔ حضرت محسنؔ کاکوروی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس وقت اگر ایک طرف ناز و ادا، مجاز و دنیا زاد اور وادیٔ الفت کے جلوے مچل رہے تھے تو دوسری طرف انیس و دبیر کے مرثیوں کی دھوم مچ رہی تھی ایسے ماحول کی روشنی اور دباؤ سے ہٹ کر صنف نعت کی طرف متوجہ ہونا جبکہ اس وقت کے عام شعری مزاق و مزاج کے بالکل مختلف تھا واقعی بڑی ہمت اور حوصلے کی بات تھی حضرت محسن کی شاعری کا جذبہ اگر معمولی یا رسمی سطح پر سامنے آیا ہوتا تو صرف اظہار عقیدت کے سوا اس کی فنی حیثیت کی کوئی تعیین نہ ہو پاتی مگر جس طرح انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ اور فن مرثیہ کو بام عروج پر پہونچایا اسی طرح محسنؔ و امیرؔ نے بھی نعت اور فن نعت کو آسمان پر پہونچا دیا اور اس کے میدان کو کمال فکر و فن کے ساتھ وسیع کیا ویسے یہ کہنا تو شاید مناسب نہیں کہ حضرت محسن نے سب سے پہلی بار فن کی حیثیت سے نعتیہ شاعری کو اختیار کیا ان سے پہلے کرامت علی خاں شہیدؔی، غلام امام شہیدؔ اور کافی مراد آبادی کے بعض نعتیہ نمونے غیر معمولی فکر و فن کی غمازی کرتے ہیں بالخصوص شہیدی کے معرکہ آرا قصیدے کی فنی حیثیت کا اعتراف خود حضرت محسن نے کیا ہے اور قصیدۂ شہیدی کی زمین پر خمسے تک لکھے ہیں البتہ یہ حقیقت ہے کہ حضرت محسن کے سامنے اردو نعتیہ شعر و ادب کے معیاری نمونے بہت کم تھے اور وسعت کے وہ امکانات جو فی الوقت نظروں سے اوجھل تھے محسن کی ابتدائی شاعری کے سامنے روشن ہونے لگے تھے انھوں نے اسی روشنی کے سہارے اپنی شاعری کو مختلف باوقار راہوں سے گذار کر اور بے شمار فنی خوبیوں سے آراستہ

کرکے نعتیہ شاعری کے میدان کو وسیع کیا اور اپنے تعلیدی دور کے باوجود سرزمین لکھنؤ میں نعتیہ شعر و ادب کا ایسا آفتاب روشن کیا کہ جس کی روشنی سارے ہندوستان میں پھیلی اور تمام اصنافِ سخن نے "کلیاتِ محسن" کا فراخدلانہ استقبال کیا۔

حضرت محسن خالص نعت کے شاعر تھے انہوں نے آغاز سے انجام تک اپنے موضوع کو صرف نعت و مدح سے متعلق رکھا اور وہ بھی اس شان و عظمت کے ساتھ کہ دبستان لکھنؤ کے وہ جملہ شعری محاسن جو نعت میں شامل ہو سکتے تھے انہوں نے پوری دیانت و امانت کے ساتھ شامل کیا اور تمام بازاری پن جنھیں نعت سے دور رکھنا ضروری تھا ان کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ نعتیہ شاعری اگرچہ بنیادی طور پر عشقِ نبی، حبِ صادق، تبلیغِ حق اور اظہارِ ندامت و التجائے شفاعت کا نام ہے لیکن اس بنیادی تعلق کے باوجود محسن نے اپنی قادر الکلامی اور فکر و فن کی بلندیوں کی روشنی میں یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ نعت اگرچہ ایک موضوعاتی شاعری ہے مگر اس کو فن اور قیمتی جستجو کی دولتوں سے نواز دیا جائے تو بڑی سے بڑی غیر موضوعاتی شاعری بھی سر جھکانے پر مجبور ہو سکتی ہے جب رسالت کے سائے میں انہوں نے اپنے معیارِ فن کے تحفظ کا ہر جگہ لحاظ رکھا ہے اور وہ کسی مقام پر بھی فن اور ہیئت کے التزام سے غافل نہیں رہے۔

خوب سے خوب تر کی تلاش انسان کی سرشت میں داخل ہے محسن نے اپنے طور پر جس تلاش و جستجو کا کارنامہ انجام دیا ہے وہ نعتیہ شاعری کے سر پر تاج کی حیثیت رکھتا ہے عظیم سے عظیم شاعری میں جن تشبیہات و استعارات لفظیات، معنی آفرینی اور تہہ داری کا پتہ چلتا ہے یہ ساری خوبیاں حضرت محسن کی شاعری میں موجود ہیں۔ محسن کی شاعری معنوی گہرائیوں، علمی بلاغتوں فنی خوبیوں اور جذباتی امنگوں کی آئینہ دار ہے اس کے علاوہ زبان کی سلاست

بیان کی صداقت، بندشوں کی چستی، محاوروں کا برمحل استعمال اور لفظوں کا عالمانہ انتخاب کلام محسن کی انفرادیت ہے تشبیہات واستعارات، واقعاتی پس منظر اور منظر کشی کا حسن ان کی شاعری میں بالکل انفرادی طور پر نظر آتا ہے اور رنگ یکساں برقرار رہتا ہے جسکی بنیاد پر ہر کس و ناکس کے لئے محسن کی شاعری کا سمجھ لینا آسان نہیں۔

محسن کے کلیات میں قصیدے مثنویاں، رباعیاں، قطعات اور غزلیں سب کچھ موجود ہیں اور ہر صنف میں انھوں نے استادانہ و انقلابی رنگ دکھایا ہے لکھنؤ قصیدوں اور مثنویوں کا مرکز رہا ہے ایک سے ایک رومانی اور عشقیہ قصیدے اور مثنویاں لکھی گئیں مگر محسن نے ان کے حسن و لطف کا جواب نعتیہ رنگ میں دیا احتیاط و پابندی اور تقلیدی اثر سے ہٹ کر دیا اور پھر اصلیت و صداقت کی ایسی چمک ابھر کر سامنے آئی کہ اساتذۂ فن کے نہ جانے کتنے قصیدے اور مثنویاں پھیکی پڑ کر رہ گئیں شاعری وہ ہے جو ذہن کو جلا بخشے، پاکیزہ قدروں کی نشاندہی کر سکے اور حق و صداقت کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دے ایسی شاعری جو عیش و سرمستی اور کھوکھلے پن میں کھو کر اپنے پائیدار انجام سے محروم رہ جائے محسن نے ایسی شاعری سے کچھ کام نہیں لیا، نعت کو فن کی روشنی میں پیش کیا اور جملہ فنوں کو نعت میں سمیٹ کر رکھ دیا۔

محسن نے اپنی شاعری میں قصیدہ اور مثنوی کی طرف خصوصی توجہ دی ان کے قصائد گلدستۂ کلام رحمت، سراپائے رسول اکرم، اور مدیح خیر المرسلین ہیں "مدیح خیر المرسلین کو بے پناہ شہرت نصیب ہوئی جس کا مطلع ہے :

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

اس قصیدے کی تشبیب کا انداز بالکل نرالا ہے جس سے پہلے نعت کے کسی شاعر نے نہیں اپنایا صنعت گری کے باوجود آمد کا زور ہے تشبیب اور گریز دونوں میں فن کا کمال عروج پر نظر آتا ہے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں "محسن کے نعتیہ کلام میں سب سے زیادہ شہرت ان کے قصیدے "مدیح خیر المرسلین" کو نصیب ہوئی جو ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں تصنیف ہوا اس ایک قصیدے کو سامنے رکھ کر محسن کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کی شاعرانہ خوبیاں نمایاں ہوجاتی ہیں۔ (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔ مطبوعہ اول ۱۹۶۵ء مٹیا محل دہلی)

ثاقب نے مکتوبات امیر مینائی کے مقدمہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ منشی امیر احمد امیر سے محسن کاکوروی کی سخن آفرینی اور بلاغت کلام کا تذکرہ کیا تو فرمایا ان کا کلام ایک عالم ہے خیالات نادرہ کا کہ اوس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے۔ (گل رعنا از حکیم عبدالحی مطبوعہ ۱۳۴۰ھ لکھنؤ ص ۴۵۵)

محسن کا ایک اور قصیدہ جو قصیدۂ شہیدی کی زمین پر خمسے کی صورت میں لکھا گیا ہے اس کا معیار بھی بھرپور ہے گویا قصیدۂ شہیدی کا شاندار جواب دیکر محسن نے مزید کمال کر دکھایا اس قصیدے میں ۱۰۶ خمسے ہیں اسی طرح ان کے فکر و فن کی معراج و بلاغت، ان کی معرکہ آرا مثنویوں مثلاً "صبح تجلی، فغان محسن، نگارستان الفت، چراغ کعبہ اور شفاعت و نجات" میں بھی نظر آتی ہے ان مذکورہ مثنویوں میں صبحِ تجلی کو جو آمد سرکار دو عالم کے ذکر میں ہے اور چراغ کعبہ کو جو شب معراج کے احوال و کوائف سے متعلق ہے زیادہ شہرت نصیب ہوئی ان ہر دو مثنویوں کی پختگی و بالیدگی، فنی گہرائی اور انداز بیان کی عظمت کے علاوہ نادر تشبیہات و محاورات سے اندازہ ہوتا ہے کہ محسن

قصیدہ و مثنوی کے کتنے عظیم شاعر تھے۔ محسن نے جو حسن و کیف اور وقار و معیار نعتیہ مثنوی و قصیدہ میں پیدا کر کے دکھا دیا بڑے بڑے شاعر غیر موضوعاتی شاعری میں یہ بات نہ پیدا کر سکے۔

حضرت محسن کی غزل گوئی :-

حضرت محسن کاکوروی اگرچہ بنیادی طور پر قصیدہ اور مثنوی کے شاعر تھے مگر ایسا نہیں کہ وہ غزل کی گہرائیوں سے واقف نہ تھے وہ غزل گوئی پر عبور کامل رکھتے تھے ان کے کلیات میں نعتیہ غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر جتنی بھی ہے فن اعلیٰ اور بلیغ معنویت کی امین و علمبردار ہے حرارت و تازگی اور گہرائی و گیرائی ایسی کہ اکثر اشعار دل کو چھونے لگتے ہیں ظاہر ہے فن بلیغ کے ساتھ جب حُبِّ رسول اور اعلیٰ قدریں بھی شامل ہو جائیں تو ان فن پاروں کی عظمت و ندرت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ محسن نے اپنی شاعری میں اپنے فن و تجربہ کا اظہار عشق رسالت اور جذبات پاکیزہ کی بنیاد پر کیا ہے۔ خود فرماتے ہیں :-

ہے تمنا کہ رہے نعت سے خالی تیری ۔۔۔ نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
تا حشر تیری مدح سے ہو میری آبرو ۔۔۔ اشراق اسی وضو سے ہو روز حساب کی

وہ اپنے فن و زبان سے محض اس طور پر تو دلچسپی رکھتے ہیں کہ شعری حُسن و بلاغت کی شہنشاہی میں کوئی لوچ نہ آنے پائے مگر اپنے اس فن کو انہوں نے روحانی جذبات و احساس اور پاکیزہ نظریات و تصورات پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا اور یہی محسن کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف ہے یہی وصف ان کی غزلوں سے بھی ثابت ہے اس بابت جو سب سے اہم بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ان کی غزلوں

کی زبان قصیدہ و مثنوی سے قدرے مختلف اور آسان ہے۔ دیگر اصنافِ سخن میں مشکل پسندی کے عناصر کے ساتھ تراکیب و تفاہیم بھی انوکھے ہیں مگر غزل کی زبان اور اس کا لہجہ اتنا دلنشین اتنا کومل اور اتنا لطیف ہے کہ وہ اپنے بیان و زبان کی جامعیت اور فن شناسی، پر اپنی خوش نصیبی اور سعادت مندی کا اظہار کرنے لگتے ہیں کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے نعت رسول پڑھنے کے لئے زبان تو عطا فرمائی نہ زبان کے تعلق سے وہ اپنی خوش نصیبی کا متعدد جگہ اظہار کرتے ہیں۔ ؎

سخن کی جان زباں ہے وہ کیوں نہ بلجائے   زبان کے لئے وہ پھر مری زباں کے لئے

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسنؔ   کلام نعتیہ رکھا مری زباں کے لئے

سخن کو رتبہ ملا ہے مری زباں کے لئے   زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لئے

اس میں کوئی شک نہیں کہ حب رسول اور ان کی شیریں زبانی نعت گوئی کے داخلی ذوق و شوق اور فطری میلان و رجحان کو واضح کرتی ہے۔ اس توفیق الٰہی پر محسن جتنا ناز کریں کم ہے محسن کی غزلیں اوصاف و محاسن کی قیمتی یادگار ہیں اور ہر جگہ حسن و لطافت اور پختگی و جامعیت کے تارے ٹنکے نظر آتے ہیں۔ آمد کا زور ہے اور فکر و فن کی تابانی ہے۔ معنی آفرینی ان کے کلام کا نمایاں جوہر ہے لمحہ لمحہ روح بیقرار ہو اٹھتی ہے محسن کی پوری شاعری پر محاورے چھائے ہوئے ہیں گویا محاوراتی زبان کے استعمال پر انھیں ملکہ حاصل تھا۔ اس فن نے ان کی غزلوں میں ایک نئی کیفیت اور ایک تازہ سرور پیدا کر دیا ہے۔

احوال سیرت نبوی، واقعات نبوی اور تواریخ اسلام سے بے شمار اشارات کے علاوہ عجز و انکسار اور تا معصیت کے اظہار سے ان کی شاعری تابناک نظر آتی ہے بلاشبہ حضرت محسن کاکوروی نے اپنے عشق و وفا کے زیر احساں

فنِ اعلیٰ کے نئے نئے گوشے عطا فرمائے اور نعتیہ شعر و ادب کی دنیا میں عظیم انقلاب پیدا کیا۔

نمونۂ کلام

کیا جھکا کعبے کی جانب کو ہے قبلا بادل
سجدے کرتا ہے سوئے یثرب و بطحا بادل

چھوڑ کر مبکدۂ ہند و صنم خانۂ برج
آج کعبے میں بچھائے ہے مصلا بادل

سبزۂ چرخ کو اندھیاری لگا کر لایا
شہسوارِ عربی کے لئے کالا بادل

بحرِ امکاں میں رسول عربی دُرِّ یتیم
رحمتِ خاصِ خداوند تعالیٰ بادل

قبلۂ اہل نظر کعبۂ ابروئے حضور
موئے سر قبلے کو گھیرے ہوئے کالا بادل

رشک سے شعلۂ رخسار کے روتی ہے برق
برق کے منہ پہ ہے رکھے ہوئے پلّا بادل

دور پہونچی لب جاں بخش نبی کی شہرت
سن ذرا کہتے ہیں کیا حضرت عیسیٰ بادل

چشم انصاف سے دیکھ آپکے دندان شریف
در یکتا ہے ترا گرچہ یگانا بادل

تھا بندھا تار فرشتوں کا درِ اقدس پر
شب معراج میں تھا عرشِ معلّٰی بادل

آمد و رفت میں تھا ہمقدم برق براق
مرغزار چمنِ عالم بالا بادل

ہفت اقلیم میں اس دین کا بجایا ڈنکا
تھا تری عام رسالت کا گرجتا بادل

دین اسلام تری تیغ دو دم سے چمکا
یا اوٹھا قبلے سے دیتا ہوا کاندھا بادل

آستانے کا ترے دہر میں وہ رتبہ ہے
کہ جو نکلا تو جھکائے ہوئے کاندھا بادل

تو وہ فیاض ہے در پر ترے سائل کی طرح
فلک پیر کو لایا دیئے کاندھا بادل

تیغ میدان شجاعت میں چمکتی بجلی
ہاتھ گلزار سخاوت میں برستا بادل

محسنؔ اب کیجئے گلزار مناجات کی سیر
کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرتا بادل

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل

دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہو بھروسا تری قوت ترا بل

ہو مرا ریشۂ امید وہ نخل سرسبز
جس کی ہر شاخ میں ہوں پھول ہر اک پھول میں پھل

آرزو ہے کہ ترا دھیان رہے تا دم مرگ
شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

نام احمد بزباں سر بلا میم بصدر
لب پہ ہو صل علیٰ دل میں مرے عز و جل

روح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل
کہ مری جان مدینے کو جو چلتی ہے تو چل

دم مردن یہ اشارہ ہو شفاعت کا تری
فکر فردا کی نہ کر دیکھ لیا جائے گا کل

یادِ آئینۂ رخسار سے حیرت ہو مجھے
گوشۂ قبر نظر آئے مجھے شیش محل

میزباں بن کے نکیرین کہیں گھر ہے ترا
نہ اٹھانا کوئی تکلیف نہ ہونا بیکل

رخِ انور کا ترے دھیان ہے بعد فنا
میرے ہمراہ چلے راہ عدم میں مشعل

حذف ہوں میرے گناہان ثقیل و خفیف
آئیں میزان میں جب افعال صحیح و معتل

میری شامت سے ہو آراستہ گیسوئے سیاہ
عارض شاہد محشر ہو اگر حسن عمل

صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

کہیں جبرئیل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

ہے بیرنگی کے آئینہ میں نقشہ شکل انساں کا
تعالیٰ شانہ یہ روپ ہے کس حسن پنہاں کا

توارد شکل حوروں میں یہی مضمون قرآں کا
مگر اللہ رے مطلع ناظم قدرت کے دیواں کا

مورخ لکھے دنتوں کا ہے عشق اس سے کوئی پوچھے
کہ خلق کے بعد ازل میں نور تھا کس روئے تاباں کا

کہوں ایمان کی سو بار اٹھا لوں سر پہ قرآں کو
کوئی ثانی نہ یزداں کا نہ اس محبوب یزداں کا

وہ ہم صورت ہے معنی پرورِ عالم کی رحمت کا
وہ ہم معنی ہے صورت آفریں کے لطف واحساں کا

خمیدہ نخلِ اعجاز اوسکے اثمارِ خوارق سے
رسیدہ میوہ اوسکی تربیت سے زہدِ عرفاں کا

بتوں کو مثلِ مرداسنگ پسیا دستِ قدرت سے
بنایا اپنے ہاتھوں سے جو مرہم زخمِ ایماں کا

لقب اُمّی و مثلِ لوحِ محفوظ اوسکے سینے میں
بھرا علمِ اولین و آخریں پیدا و پنہاں کا

حمایت اہلِ عالم کی اشارہ عین رحمت کا
شفاعت عاصیوں کی اک کرشمہ چشمِ احساں کا

خودی سے بعد جو پہلے الف کو نون ایماں ہے
خدا سے قرب جو پیچھے الف سے نورِ ایماں کا

خدا جانے حبیبِ کبریا جانے کہ کیا گذری
ہوا جب سامنا عشق آفریں کے روئے تاباں کا

•

اٹھتی ہے لامکاں سے جو چلمن حجاب کی
آمد ہے کس پیمبرِ عالی جناب کی

مصحف کا ایک صفحہ جبیں ہے جناب کی
تقریظ حق نے لکھی ہے اپنی کتاب کی

یا ایھا النبی علی وجھک السلام
سرخی کتابِ دیں میں ہے ہر ایک باب کی

پنکھے پروں کے قدسیوں کے زیبِ دوش تھے
جس شب کو گرم رو تھی سواری جناب کی

چلنے لگی ہوائے شفاعت جو تیز تیز
آتش نہ کیوں کہے مری مٹی خراب کی

تھا تو ہی تو اشاعتِ توحید کے لئے
تھی فرد ازل سے فرد ترے انتخاب کی

جب انبیا میں حق نے تجھے منتخب کیا
سطریں اوچھل پڑیں ورقِ انتخاب کی

وہ آنکھ پھوٹے جس کو دکھائی نہ دے خدا
جب یاد آئی سرورِ عالی جناب کی

تا حشر تیری مدح سے ہو میری آبرو
اشراق اسی وضو سے ہو روزِ حساب کی

بالائے ہفت چرخ ہے محبوبِ حق کا نور
ہے لامکاں میں دھوپ اسی آفتاب کی

ارواحِ انبیا کو وہ نسبت ہے تیرے ساتھ
جو نسبت آفتاب سے ہے ماہتاب کی

جسمیں نہ ہو محبتِ محبوبِ حق کا گھر
مٹی خراب اوس دلِ خانہ خراب کی

پہونچے فلک پہ تیرے قدم کے مٹے ہوئے
ذروں کو لے اڑی ہے ہوا آفتاب کی

مقصودِ آفرینش و محبوبِ کبریا
کیا بات ہے جناب رسالت مآب کی

پہلے پڑھا سوالِ نکیرین سے درود
کیا بات ہے مرے دلِ حاضر جواب کی

یارب ہو خاتمہ مرا حضرت کے نام پر
بس یہ اخیر فصل ہے میری کتاب کی

محسنؔ کی التجا ہے فنا فی الرسول ہو
اے بحرِ فیض بے خبر اپنے حباب کی

●

سخن کو رتبہ ملا ہے مری زباں کے لئے
زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لئے

ازل میں چن لئے خالق نے رنگ رنگ درود
بجائے لعل و گہر تیرے ارمغاں کے لئے

تو مصرِ منزلِ مقصد کا سعد اکبر ہے
جو مشتری مہِ کنعاں تھا کارواں کے لئے

نکالے ڈوبے ہوئے بیڑے دین کے اور نوحؑ
تھے ناخدا اگر اک کشتیٔ رواں کے لئے

لکھا قلم نے یہ بڑھ کر درود کرسی پر
بچھی رہے یہ کسی خواندہ میہماں کے لئے

چمک تیرے یاروں سے منزلِ توحید
یہ چار اکے بنائے ہیں لامکاں کے لئے

احد کے پہلو میں کیا کہہ رہا ہے نقطۂ میم
بلاؤ قدسیوں کو حلِ چیستاں کے لئے

دکھائی خامۂ تنزیہہ حق نے تیری شبیہہ
جو بے نشانی کو خواہش ہوئی نشاں کے لئے

تھی خوش نصیبی عرشِ بریں شبِ معراج
کہ اپنے سر پہ قدم شاہ مرسلاں کے لئے

ہزار رشک کرے لیکن ایسی وقعت کی
تھی سرنوشت کہاں فرقِ فرقداں کے لئے

کمالِ حسن دکھاتا ہے ماہ تو کہہ دو
کہ صبح دم مرے گھر آئے امتحاں کے لئے

سوائے آئینۂ جلوۂ شہِ لولاک
نہ تھا محل کوئی تصویرِ کن فکاں کے لئے

نہ تھا بجز قدِ بالائے سرورِ عالم
جو کوئی تیر تھا قوسین کی کماں کے لئے

نزولِ نسخۂ پاکیزۂ کلام مجید
ترے عروج ترے عہدہ کے بیاں کے لئے

عجب نہیں جو کہے تیرے فرش کو کوئی عرش — کہ لامکاں کا شرف ہے ترے مکاں کیلئے
بہار بڑھ گئی حضرت کے جاں نثاروں سے — اسی چمن سے قلم لی گئی جناں کے لئے
کریگا کیا تری توصیف کلک منشی چرخ — زبان چاہیئے منہ چاہیئے بیاں کے لئے

خدا کے سامنے محسنؔ پڑھوں گا وصف نبی
سجے ہیں جھاڑ یہ باتوں کے لامکاں کے لئے

بقیہ نعتیہ شاعری کی ابتدا و ارتقا

نبھانی (سابق وزیر انصاف بیروت) وغیرہم نے بھی عربی نعتیہ شاعری کی خصوصی خدمات انجام دی ہیں بالخصوص علامہ نبھانی صاحب تصانیف کثیرہ کے علاوہ آپ زبردست شاعر اسلام بھی تھے المجموعۃ اللبھانیہ فی المدائح النبویۃ و اسماء رجالہا آپ کا عظیم کارنامہ ہے یہ کتاب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جس میں بے شمار عربی شعراء کے نعتیہ کلام کو جمع کیا گیا ہے حضرت نبھانی کا نعتیہ دیوان ، "دیوان المدائح" عقیدت و محبت اور فکر و فن کا قیمتی تحفہ ہے۔

ایران میں فخر الدین اسعد گرگانی (م ۴۴۶ھ) کو فارسی کا سب سے پہلا نعت گو شاعر سمجھا جاتا ہے اسکے بعد اپنے اپنے عہد میں سنائیؔ، خاقانیؔ، نظامیؔ، مولائے رومؔ، عراقیؔ، سعدیؔ، تبریزیؔ جامیؔ، عرفیؔ، فیضیؔ، قدسیؔ، شوقیؔ، اور نظیریؔ وغیرہم نے فارسی نعتیہ شاعری کی خوب زلفیں سنواریں اور ساری دنیا میں ان مذکورہ شعراء کے تصورات و خیالات اور فکر و فن اور فصاحت و بلاغت کی شہرت ہوئی۔ عرب و ایران کے نعتیہ شعر و سخن کی تحریک کی چمک جہاں جہاں بھی گئی ان میں ہندوستان سب سے آگے رہا یہاں کے بھی خاصان خدا، عاشقان رسول اور دانشوروں نے نعتیہ شاعری کو اپنا ادبی و مذہبی فریضہ سمجھا اور صنف نعت کا آفتاب روشن کیا۔ تقریباً دو سو سال کی اردو نعتیہ شاعری کا اتنا بڑا ذخیرہ ہو گیا کہ اس معاملہ میں اب دنیا کی کوئی زبان مقابلہ نہیں کر سکتی نعت گو شعراء اور ان کے نعتیہ دواوین کا شمار کرنا مشکل ہے۔

حضرت امیر مینائیؔ

مولوی کرم احمد مینائی کے بیٹے منشی امیر احمد مینائی بعہد نصر الدین حیدر ۱۶ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا علیہ الرحمہ کے خانوادے سے ہیں اس لئے مینائی لکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی درس نظامیہ کی کتابیں مفتی سعد اللہ اور ان کے ہمعصر علمائے فرنگی محل سے پڑھیں اور عربی و فارسی میں عبور حاصل کیا امیر مینائی نہایت ذہین و طباع منکسر المزاج، صاحب زہد و تقویٰ اور صوفی مشرب انسان تھے۔ سلسلہ چشتیہ کے بزرگ حضرت امیر شاہ صاحب سجادہ نشین سے بیعت حاصل تھی حدیث و فقہ اور فضائل و سیر کے علاوہ طب، جفر اور علم نجوم سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے لکھنؤ میں چاروں طرف اصناف سخن کی پھیلتی ہوئی فضاؤں کا اثر امیر نے بھی قبول کیا اور صغر سنی ہی میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا طبیعت کی موزونیت نے بہت جلد رنگ دکھانا شروع کیا۔ منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہوئے کچھ دنوں کی محنت و کاوش اور مشق و ریاض کا ایسا نتیجہ نکلا کہ اپنے استاد سے بھی آگے نکل گئے۔ ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں شاعری کی شہرت دربار شاہی تک پہونچی اور نواب واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی نواب نے کلام سنا اور بے حد مسرور ہوئے۔ نواب کی خواہش پر دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" تصنیف فرمائیں دربار میں پیش کی گئیں خلعت فاخرہ اور انعام و اکرام سے

نوازے گئے اس وقت سے امیر کی شہرت و عظمت میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا اسی دوران حالات نے پلٹا کھانا شروع کر دیئے۔ غدر کے زمانے میں نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد شعرائے دربار کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ ادھر ادھر معاش و سکون کے لئے منتشر ہونے لگے غدر کے بعد قسمت نے یاوری کی اور نواب یوسف علی خاں والئ ریاست رامپور کی طلبی پر ۱۲۷۵ھ میں لکھنؤ سے رامپور چلے گئے جہاں دربار سے وابستہ ہوئے اور پریشانی کے دن دور ہوئے نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد حکومت میں شعراء اور شاعری دونوں کو ایک نیا عروج حاصل ہوا۔ نواب کلب علی خاں جیسے ادب نواز نے بے شمار شعراء کو اپنے دربار سے وابستہ کیا اور ان کی بھرپور کفالت کی جن میں استاد داغ بھی شامل تھے۔ اسی دوران نواب کلب علی خاں نے امیرؔ کی شاگردی اختیار کی جس کی وجہ سے انھیں بڑی آسودگی نصیب ہوئی اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہنے لگے ۴۳ برس رامپور میں بہت شان سے ساتھ گذارے نواب صاحب کی وفات کے بعد درباری شعراء کو ایک بار پھر دھچکا پہونچا امیرؔ بھی متفکر ہوئے ۱۹۰۰ء میں نظام حیدرآباد کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے جہاں آخر عمر کے چند ایام گذارنے کے بعد تقریباً ۷۲ سال کی عمر میں ۱۹ جمادی الاولی ۱۳۱۸ھ میں داعئ اجل کو لبیک کہا استاد داغ نے قطعۂ تاریخ وفات لکھ کر اپنی عقیدت و محبت کا یوں اظہار کیا ہے ؎

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی
قصر عالی پائے جنت میں امیرؔ ۱۳۱۸ھ

امیرؔ مینائی نے اپنے بعض کارناموں کی بنیاد پر وہ مرتبہ حاصل کیا جو لکھنؤ کے بہت کم شاعر کو نصیب ہوا ان کی زندگی قابل قدر خدمات سے معمور رہی۔ اپنی ہمعصر شخصیتوں

میں ہمیشہ ممتاز رہے بے پناہ زود گو اور ماہر نثار تھے۔ ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں ہی ادب کی آبرو ہیں جس صنف سخن میں طبع آزمائی کی لعل و گہر کے ڈھیر لگا کر رکھ دیئے مختلف اصناف سخن پر مشتمل ان کے اولین دیوان کا نام "مرآۃ الغیب" ہے دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" ہے جو دیوان اول سے زیادہ زوردار اور دلکش ہے "محامد خاتم النبیین" ان کے نعتیہ کلام کا دیوان ہے چند قصائد اور غزلوں کا ایک مجموعہ "غیرت بہارستان" ہے دو مثنویاں "نور تجلی، ابر کرم" اور ایک نعتیہ مسدس کا عنوان "ذکر شاہ انبیاء" ہے نثر میں "خیابان آفرینش" مولود مسعود کے موضوع پر بہترین تصنیف ہے "انتخاب یادگار" تذکرۂ شعرائے رامپور سے متعلق ہے جسے اپنے شاگرد نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر تصنیف کیا تھا ۱۲۹۷ھ میں چھ دا سوختوں کا مجموعہ "مینائے سخن" کے نام سے شائع ہوا۔ "سرمۂ بصیرت" میں ان عربی و فارسی لفظوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے جو اردو میں عام طور پر غلط طریقے سے استعمال ہوتے رہتے ہیں اردو محاورات و الفاظ اور اعراب کی ایک مختصر لغت "بہار ہند" ترتیب دی ہے حضرت امیر مینائی کا عظیم کارنامہ "امیر اللغات" کا نقش اول سمجھا جاتا ہے مگر افسوس کہ یہ کارنامہ پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا صرف دو حصے الف ممدودہ اور الف مقصورہ کے ترتیب پا سکے اور اشاعت پذیر ہوئے جب کہ اس امیر اللغات کو آٹھ جلدوں میں شائع ہونا تھا غالب کی طرح امیر کا بھی حلقۂ احباب و متعلقین بہت وسیع تھا اور وہ بھی دوستوں کو خطوط لکھنے کا خوب شوق رکھتے تھے ان کے شاگرد رشید احسن اللہ خاں ثاقب نے خوبصورت دیباچے کے ساتھ ان کے خطوط کا مجموعہ شائع کر دیا ہے ان کے علاوہ صبح ازل، شام ابد، لیلۃ القدر، جوہر انتخاب، اور گوہر انتخاب

جیسی چھوٹی بڑی تصانیف چھوڑیں۔ استاد داغ کے بعد امیر مینائی کو "کثیر التلامیذ" استاد سمجھا جاتا ہے مگر اصحاب علم وادب نے ان کے تلامذہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ سیکڑوں شاگردوں میں چند کے مشہور نام مندرجہ ذیل ہیں۔
آہ امیٹھوی، نواب کلب علی، صفدر، جاہ، جلیل، ریاض، کوثر، برہم، وسیم حیران، عابد، رضا، دل، قرار، ناظم، ثاقب، اصغر، مضطر، سرشار، اختر اور خوشدل مظفر پوری وغیرہم۔ ان میں حضرت امیر کے ایسے شاگردوں کی بھی خاصی تعداد ہے جنھوں نے اپنے استاد سے استفاضہ روحانی بھی کیا اور زیادہ تر نعت رسول کہنے کا شرف حاصل کیا اور نعتیہ شاعری کا خاصا ذخیرہ یادگار چھوڑا گویا لکھنؤ کے نعتیہ شعر وادب کے ماحول میں امیر مینائی نے انقلاب تو پیدا ہی کیا ان کے تلامیذ نے بھی اس فن کو خوب سنوارا نکھارا۔ چند نعت گو تلامذ کے نام یہ ہیں: حفیظ، ثمر، آزاد امیٹھوی۔ آہ امیٹھوی، جگر سیوانی، کوکب سندیلوی، اثیم خیرآبادی، اشک بلند شہری اور اعجاز لکھنوی وغیرہم۔
غزل کی ہیئت میں نعت کہنے کا رواج تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں اپنے شباب پر آیا اور اس عہد میں متعدد قابل قدر شعرا سامنے آئے جن میں غلام امام شہید، کرامت علی شہیدی، کافی مرادآبادی اور لطف علی لطف وغیرہم کی خدمات کو سرفہرست سمجھا جاتا ہے لکھنؤ کی شعری روایت میں نعتیہ رنگ و نور کا اضافہ کرنے کے سلسلے میں مولانا غلام امام شہید کی خدمات کو فوقیت حاصل ہے۔ نعتیہ غزلوں کی پھر ایسی خوشبو اڑی کہ سارا لکھنؤ معطر ہو کر رہ گیا شہید کے بعد اس مقدس روایت کو آگے بڑھانے میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی نے خصوصی توجہ کی اور اپنے پیچھے نعتیہ شعر وادب کا قیمتی ذخیرہ چھوڑا۔
امیر مینائی ایک صوفی مشرب اور مذہبی انسان تھے وہ جتنا ذوق

غزل گوئی کا رکھتے ہیں اسی طرح نعت گوئی کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے تھے بڑی عقیدت و محبت اور والہانہ پن کے ساتھ نعتیں کہیں۔ چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں صرف امیر مینائی ہی لکھنؤ کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے کثرت کے ساتھ نعتیہ (عارفانہ غزلیں) کہنے کی سعادت حاصل کی) اور اپنے عہد میں سب سے پہلے باقاعدہ ضخیم دیوان "محامد خاتم النبیین" (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۳ء) پیش کرنے کا فخر حاصل کیا۔ عشق رسالت کی خوشبوؤں میں رچا بسا یہ دیوان ایک عاشق کا ایسا جذباتی نذرانہ ہے جس میں واردات قلبی کی حکایتیں ہیں، آرزوؤں کا سیلاب ہے، وارفتگئ شوق کی تجلیاں ہیں، احساس جرم کی بے تابیاں ہیں، اشک ندامت سے بھیگے ہوئے دامن کی فریاد ہے اور مغفرت کے لئے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی التجائیں ہیں۔ محامد خاتم النبیین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امیر کے سینے میں شمع عشق رسالت کی لَو کتنی تیز ہے اور ہر جگہ کتنے والہانہ طور پر رطب اللسان نظر آتے ہیں عشق رسالت کی رعایت اور منصب رسالت کی پاسداری نعتیہ شاعری کا سب سے نازک پہلو ہوتا ہے۔ امیر نے اس اہم نزاکت کا ہر جگہ لحاظ رکھا ہے اور اپنی محبت و عقیدت کے موتی بکھیر کر رکھ دیے ہیں

ابتدائے انتہائے مصطفٰے
جانتا ہے بس خدائے مصطفٰے

آپ کی مرضی سے ہوگا سارے عالم کا حساب
آپ کے قبضہ میں ہوگا سارا دفتر دیکھنا

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضائے کلیم
جو ملا جس کو اسی گھر کے بدولت پایا

کھنچا ایسا بری نقشہ سراپائے محمد کا
کہ نقاش ازل نے آپ سایہ رکھ لیا قد کا

اٹھائے آنکھ سے پردہ دوئی کا حسن یکتائی
جدھر دیکھوں نظر آئے مجھے جلوہ محمد کا

کہا ہوا آئے رسولوں میں جو سب سے پیچھے
نور تو خلق ہوا آپ کا سب سے آگے

امیر مینائی ایک تعلیم یافتہ فیض یافتہ اور صاحب فکر و نظر شاعر تھے عشق و محبت ورثہ میں پایا۔ سیرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق اور دیوانے تھے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں ایسے اشعار کی کثرت ہے جو جو نبی کے حسن و جمال، عروج و کمال، رحمت و عظمت، سیرت و صورت، معجزات و غزات، اخلاق حسنہ، علم غیب اور شان بیر دری کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ امیر مینائی کا شعری فن جس طرح ان کی جمالیاتی و مجازی غزلوں میں نکھرا اور ابھرا ہوا نظر آتا ہے وہی تڑپ، وہی لچک، وہی بانکپن، وہی لطافت اور وہی شعلگی ان کے نعتیہ دیوان میں بھی موجود ہے بلکہ ان کے روحانی جذبات و افکار کی وسعتیں اور گہرائیاں ان کی غزلوں پر بھاری نظر آتی ہیں صنف نعت کی رعایت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کی محتاط روش، پاکیزہ فن اور قابل قدر شعری لوازم نے عشق رسالت کے ایک سے ایک قیمتی موتی بکھیرے ہیں فکروں میں بلندی ہے، خیالات میں وقار ہے اور تصورات میں غضب کی وسعت ہے۔ بہت سے اشعار معمولی قاری کے بس کے نہیں عمق و تہہ داری اچھے اچھوں کو حیرت میں ڈال سکتی ہے ان کی نعتیہ شاعری کسی نواب کے حکم کا نتیجہ نہیں جس کی بنیاد صرف آورد پر رکھی گئی ہو بلکہ یہ روحانی اشعار ان کے دل کی آواز ہے۔ ان کے منصب کی دھڑکنیں ہیں۔ ان کی محبت کا حاصل ہیں اور ان کے ایمانی احساسات کے ترجمان ہیں۔ نعتیہ شاعری باعث ثواب و برکت اور ذریعۂ نجات و مغفرت ہے اس فضیلت سے قربت رکھنے کے باوجود امیر مینائی نے اپنی نعتیہ شاعری میں تجربہ و فن، جدت افکار اور ہیئت سازی کا بھی خصوصی خیال رکھا ہے اور اس صنف کو بعض ایسی روشنیاں عطا فرمائیں کہ ان کی نعتیہ غزلیں اردو ادب کا عظیم تر شرف حاصل کر گئیں۔ لہجے کی لطافت، لفظوں کی خوبصورت بندش اور

عمرد ں کی غیر معمولی تلاش اور عام فہم محاوراتی زبان، نعتیہ غزلوں کی تاریخ میں زبردست اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے اپنے عہد میں صرف امیر کی وہ عظیم الشان نعت گو نظر آتے ہیں جنھوں نے غزلوں کے رنگ و آہنگ میں نعت کے لئے کثرت سے نت نئی زمینوں کو ایجاد کیا اور خیالات میں غیر معمولی پھیلاؤ کے امکانات روشن کیے۔ امیر کی بیشتر زمینوں پر بڑے سے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے اور ان کے افکار کو مختلف انداز کے جامے پہناتے رہے۔ امیر مینائی کی نعتیہ شاعری میں اگرچہ ہندی الفاظ کا بہت کم استعمال ہوا ہے لیکن جہاں جہاں بھی ہندی آمیزش کا پتہ چلتا ہے وہ اشعار بھی ایک نئی کیفیت اور نئے بانکپن کی غمازی کرتے ہیں۔

بعض شعرائے متقدمین کی طرح لفظ یثرب کا استعمال امیر نے بھی کثرت کے ساتھ کیا ہے جبکہ سختی سے پرہیز کرنا چاہیئے تھا ہجرت کے بعد اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس کا نام طیبہ رکھا اور یثرب جیسے منحوس نام کے لکھنے بولنے کو منع فرمایا۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلے کے اکثر شعرا اس تنبیہہ و تاکید سے لاعلم رہے ہیں ورنہ قصداً ایسی غلطی کی امید سمجھ میں نہیں آتی۔ لاعلمی ہی کی بنیاد پر یہی غلطی شہید کی، لطف، محسن کاکوروی اور ڈاکٹر اقبال وغیرہم سے بھی سرزد ہوئی ہے واضح ہو کہ یثرب اور طیبہ کا ایک ہی وزن ہے لہذا قارئین کو یثرب کی جگہ ہمیشہ طیبہ ہی پڑھنا سمجھنا چاہیئے شرعی اور اعتقادی نقطۂ نظر سے چونکہ یہ تحریف و تبدیلی جائز و مستحسن ہے اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

محامد خاتم النبیین میں غزلوں کے علاوہ قصیدے، منقبت، ترجیع بند، مخمس، تضمین اور رباعیاں سب کچھ شامل ہیں۔ دیوان کے شروع میں امیر کے

چند نعتیہ قصیدے، ان کے فکر وفن زور بیانی اور پختہ اسلوب کے نادر نمونے ہیں۔ شہیدی کے معروف قصیدے کی زمین میں ایک سو چھپن اشعار پر مشتمل امیر نے بھی نعت لکھی اور اپنی فکری بلندیوں کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ اسی زمین میں محسن کاکوروی کے قصیدے پر امیر نے ایک سو پانچ خمسے لکھے ان کے علاوہ شیخ سعدی، حافظ شیرازی اور حضرت جامی کی غزلوں پر بھی متعدد تضمین و خمسے کہے۔ رباعیوں کی تعداد اٹھارہ ہے۔ پورا دیوان حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب یافتہ ہے اور تقریباً ایک سو بائیس غزلیں ہیں۔ مناجات پر دیوان کا اختتام ہے۔

نمونہ کلام

بالائے آسماں کہ سر لامکاں نہ تھا ۔۔۔ احمد کے حسن پاک کا جلوہ کہاں نہ تھا
پڑتی دل عدو پہ نہ کیونکر سنان رشک ۔۔۔ اس نوک کا حجاز میں کوئی جواں نہ تھا
معراج کے سفر میں ملائک تھے راستے پہ ۔۔۔ افسوس میں غبار پس کارواں نہ تھا
ڈرتا تھا روز عرض دلا دل کسے کہی ۔۔۔ کچھ اور اضطراب دم امتحاں نہ تھا
جلدی تھی کیا خوان شفاعت تھا میرے ہاتھ ۔۔۔ تجھ سا غلام تھا میں کوئی میہماں نہ تھا
فارغ ہر ایک غم سے رہے ساکن حجاز ۔۔۔ کیا اس زمیں کا تختہ تہہ آسماں نہ تھا

اچھا ہوا کہ الفت حضرت میں جان دی
ان داموں اے امیر یہ سوداگراں نہ تھا

— (۲) —

ہے رنگ اسی سے مہر کا فق آسمان پر ۔۔۔ جس نے کیا تھا ماہ کو شق آسمان پر
دل کو تڑپ دکھاؤں جو حضرت کے عشق میں ۔۔۔ پہونچیں زمیں کے ہفت طبق آسمان پر

حضرت نے خاک پا سے کیا اسکو سرفراز
ثابت ہوا زمین کا حق آسمان پر

اس تاجدار دیں کا جو لکھا ہے ہم نے وصف
ٹوپی اچھالتا ہے ورق آسمان پر

اٹھوائیں بوجھ آپ جو اپنے وقار کا
آجائے قدسیوں کو عرق آسمان پر

آتی ہے مجھ کو یاد مدینے کی گل زمیں
جس وقت کھولتی ہے شفق آسمان پر

تھے جلوہ گر زمین پہ حضرت مگر امیرؔ
دیتے تھے قدسیوں کو سبق آسمان پر

— (۳) —

دل کبھی قصد زیارت میں جو دم لیتا ہے
چل کھڑے ہونے کی شوق اس سے قسم لیتا ہے

قصدِ ہستی کا جو کرتا ہے تو ہمسر اس کا
راستے ہی سے وہ پھر راہ عدم لیتا ہے

گھر سے چلتا ہے مدینے کی طرف جو زائر
ہر قدم بڑھ کے ثواب اس کے قدم لیتا ہے

حکم دیتے ہیں جو حضرت تو برہمن کیسا
اٹھ کے بت خانہ سے بت راہ حرم لیتا ہے

کیوں نہ سمجھے گا وہ طاعت میں کسی کی محنت
مول شداد سے جو باغ ارم لیتا ہے

میں بھی ہوں سید محمد کے عزاداروں میں
تعزیہ رکھتا ہے دل نالہ علم لیتا ہے

مدح حضرت سے ملا ہے مجھے رتبہ یہ امیرؔ
نام تعظیم سے حسانِ عجم لیتا ہے

— (۴) —

کیا چین آئے روضۂ شاہ زمن سے دور
تڑپے نہ کس طرح جو ہو بلبل چمن سے دور

ہاتھوں میں دوستوں کے نہ آئے وہ سلسلہ
دشمن کی آنکھ زلف شکن در شکن سے دور

پردہ رہے لحد میں بھی احباب شاہ کا
دزد کفن کا ہاتھ الٰہی کفن سے دور

گویا زبان شمع جو ہوتی پکارتی
پروانہ سے کہو کہ رہے انجمن سے دور

اے شوق چل شتاب مدینے کا قصد کر
ایسا نہیں ہے وادیِ غربت وطن سے دور

کیونکر تھمیں سرشک جو ہو مدتوں سے دور
یعقوب اور یوسف گل پیرہن سے دور

نکلے جو کچھ زباں سے امیرؔ آپ کبھی نہیں
گوش بشر نہیں ہے بشر کے دہن سے دور

(۵)

قبضہ پائیں گے کبھی دل خلد میں گلزار پر
داغ کھاتے ہیں جو عاشق آپ کے رخسار پر

طائران عرش سے آنکھیں ملاتے ہیں طیور
بیٹھ کر اس روضۂ پرنور کی دیوار پر

وہ نبی کہتے تھے تمہارے نام سے یا شاہ دیں
منکشف ہے حال یوسف مردم بازار پر

کیوں نہ مومن دل سے ہوں وارفتۂ ابروئے شہ
راہ چلنا ہے صراط حشر کی دیوار پر

دور باغ شرع سے ہے جس کو کہتے ہیں خلاف
کب ہیں ہم کانٹے لگا تھی فردوس کی دیوار پر

مدحت دندان مولا اس میں ہوتی ہے رقم
ابر نیساں کا گماں ہے کلک گوہر بار پر

چشم مولا سے یہ ہم چشمی کا دعویٰ کیا کرے
مردنی چھائی ہوئی ہے نرگس بیمار پر

نامۂ عصیاں ہرا کیوں کر نہ دھو جائے امیرؔ
فوق ہے ابر کرم کو ابر دریا بار پر

— (۶) —

خلق کے سرور شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم
مرسل داور خاص پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

بحر سخاوت کان مروت آیۂ رحمت شافع امت
مالک جنت قاسم کوثر صلی اللہ علیہ وسلم

دولت دنیا خاک برابر ہاتھ کے خالی دل کے تونگر
مالک کشور تخت نہ افسر صلی اللہ علیہ وسلم

رہبر موسیٰ ہادی عیسیٰ تارک دنیا مالک عقبیٰ

ہاتھ کا تکیہ خاک کا بستر صلی اللہ علیہ وسلم
سرد خراماں چہرہ گلستاں جبہۂ تاباں مہر درخشاں
سنبل پیچاں زلف معنبر صلی اللہ علیہ وسلم
مہر سے مملو ریشہ ریشہ نعت امیرؔ اپنا پیشہ
ورد ہمیشہ رہتا ہے اکثر صلی اللہ علیہ وسلم

شاہ احمد رضا خاں بریلوی

اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی ۱۰ شوال المکرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۵۶ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد علامہ علی نقی خاں نے محمد نام رکھا اور تاریخی نام المختار، لیکن جد امجد علامہ رضا علی خاں نے احمد رضا تجویز فرمایا بعد میں خود فاضل بریلوی نے اپنے نام کے ساتھ عبد المصطفیٰ کا اضافہ کیا۔ بچپن ہی سے انتہائی ذہین و زیرک اور غیر معمولی سوجھ بوجھ کے مالک تھے رسم بسم اللہ خوانی ہی کے موقع پر مولوی صاحب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ چار سال کی عمر میں قرآن حکیم ناظرہ ختم کیا۔ اس کے بعد صرف ۹ ماہ کی قلیل مدت میں قرآن حکیم کے حافظ ہوئے۔ میزان و منشعب کی تعلیم مرزا غلام قادر بیگ بریلوی سے حاصل کی بقیہ معقول و منقول کی ساری کتابیں اپنے والد گرامی سے پڑھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے والد ماجد اپنے عہد کے کتنے عظیم عالم دین تھے شرح چغمینی کے کچھ اسباق مولانا عبد العلی رامپوری اور علم تکسیر و جفر کی تعلیم علامہ شاہ ابوالحسین احمد نوری علیہ الرحمۃ سے حاصل کی ان کے علاوہ شاہ آل رسول مارہروی، شیخ احمد بن زین دحلان مکی، شیخ عبد الرحمٰن سراج مکی اور شیخ حسین بن صالح بھی آپ کے اساتذہ و شیوخ میں شامل ہیں۔ یہ بڑی حیرت انگیز حقیقت ہے کہ فاضل بریلوی نے ۱۳ سال ۱۰ ماہ اور ۵ دن میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی اسی سال والد ماجد نے افتاء کی ساری ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی ۱۴ شعبان ۱۲۸۶ھ

کو مسئلہ رضاعت سے متعلق آپ نے سب سے پہلا فتویٰ لکھنے کی سعادت حاصل کی والد گرامی نے اولین فتویٰ پر خوش ہو کر انعام عطا فرمایا۔ فاضل بریلوی نے علوم درسیہ اور دیگر جتنے بھی علوم و فنون کی تحصیل فرمائی اُنکی تعداد ۵۷ سے کم نہیں ہے۔ عالم اسلام میں ایسے نایاب عالم کی نظیر شاید ہی مل پائے جو نہ صرف اتنے زیادہ علوم و فنون پر حاوی تھا بلکہ اکثر و بیشتر علوم و فنون پر ایک سے ایک قلمی یادگاریں بھی چھوڑیں۔ فاضل بریلوی ایک کثیر التصانیف مصنف و مولف تھے معدقہ تحقیق کے مطابق آپ کی تصانیف و تالیف کی تعداد ہزار تک پہنچتی ہے پوری فہرست شاید ابھی بھی اشاعت سے محروم ہے تاہم ماہنامہ المیزان کے "امام احمد رضا نمبر"، شمارہ مارچ ۱۹۷۶ء میں ۵۴۸ کتب و رسائل اور حواشی کی ادھوری فہرست اس طرح پیش کی گئی ہے۔

موضوعات	تعداد کتب	موضوعات	تعداد کتب
تفسیر	۱۱	عقائد و کلام	۵۴
حدیث، اصول حدیث	۵۲	فقہ، اصول فقہ، لغت فقہ، فرائض، تجوید	۲۱۴
تنقیدات	۴۰	تصوف، اذکار، اوفاق، تعبیر، اخلاق	۱۹
تاریخ سیر، مناقب، فضائل ادب، نحو، عروض		جفر و تکسیر	۱۱
نعت	۵۵	مثلث، ارثماطیقی، لوگارثم	۸
ہیئت، ہندسہ، ریاضی	۲۱	جبر و مقابلہ	۴
منطق و فلسفہ	۶	توقیت، نجوم، حساب	۲۲

ان میں تقریباً سو ۱۰۰ سے زائد کتب و رسائل اور حواشی تو صرف عربی زبان میں ہیں۔

۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں فاضل بریلوی اپنے والد ماجد کے ہمراہ حضرت شاہ

آل رسول مارہروی قدس سرہٗ کی خدمت میں مارہرہ ضلع ایٹہ حاضر ہوئے اور سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے اور اسی وقت اجازت و خلافت سے بھی نوازے گئے۔ شیخ محترم اپنے مرید و خلیفہ فاضل بریلوی پر ناز فرماتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں فاضل بریلوی نے پہلی بار اپنے والد ماجد کی معیت میں مناسک حج ادا کئے اس سفر کے دوران حرمین شریفین کے علمائے اکابر مفتی شافعیہ سید احمد زینی دحلان مکی، مفتی حنفیہ شیخ عبدالرحمٰن سراج اور شیخ حسین بن صالح نے حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، صحاح ستہ اور مختلف سلاسل کی اسناد و اجازات مرحمت فرمائیں۔ شیخ حسین بن صالح فاضل بریلوی کو اپنے گھر لے گئے اور آپ کی پیشانی پکڑ کر دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد فرمایا انی لاجد نور اللّٰہ من ھٰذا الجبین (بیشک میں اس پیشانی میں اللہ کا نور پا رہا ہوں) فاضل بریلوی کو جن تمام سلاسل کی اجازات حاصل تھیں ان کی تعداد سولہ ہے اسناد مصافحات کی تعداد ۴ اور مختلف اذکار، اشغال اور اعمال کی اجازات کی تعداد ۱۶ ہے ایسی نعمتیں بڑے مقدر والوں کے حصے میں آتی ہیں۔

چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد جب کہ دیار حجاز کے علما و فضلا فاضل بریلوی کی کی تبحر علمی اور عشق رسالت سے واقف ہو چکے تھے ۱۳۲۳ھ میں دوسری بار حج بیت اللہ کو گئے تو اہل مکہ و مدینہ نے آپ کا فراخ دلانہ استقبال کیا اور وفور عقیدت و محبت میں لوگ جوق در جوق آپ کے پاس حاضر ہوتے بہت سے علماء و فضلاء نے آپ سے تحریری و زبانی اجازت حاصل کی جنھیں تحریری اجازت نہ دے پائے تھے ان کے نام وطن پہونچنے کے بعد سند روانہ کی۔ فاضل بریلوی کے وہ مکی و مدنی خلفاء جنھیں اسناد عطا کی جا چکی تھیں یا کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ روانہ کی گئیں ان کی تعداد ۳۲ ہے (تفصیل کے لئے

دیکھئے الاجازات المتینہ) ان کے علاوہ بھی ہند و پاک اور حرمین شریفین میں پھیلے ہوئے آپ کے خلفا کی ایک بڑی تعداد تھی آپ نے اپنے عمرِ عزیز کے دوراں متعدد علمی کارنامے انجام دیئے اور چار ایسی معرکہ آرا کتابیں تصنیف فرمائیں جس نے حجازی علماء کو حیرت میں ڈال دیا اور ہر طرف علوم و فنون کی دھوم مچ گئی۔ کتابوں کے نام یہ ہیں :۔

۱۔ النیرة الوضیه فی شرح الجوهرة المضیه

۲۔ الدولة المکیة بالمادة الغیبیة

۳۔ کفل الفقیه الفاهم فی احکام قرطاس الدراهم

۴۔ الاجازة الرضویة لمبجل مکة البهیه

چند سوالات کے جواب میں دو حصوں پر مشتمل الدولة المکیہ کو دو نشستوں میں بزبان عربی صرف ساڑھے آٹھ گھنٹے میں تصنیف فرمایا جو آپ کی قدرت عربی اور تبحر علمی کا نمایاں ثبوت ہے۔ ان علمی کارناموں پر بے شمار علمائے حجاز نے عقیدتمندانہ و عالمانہ تقاریظ و تاثرات قلم بند فرمائے۔ جو فاضل بریلوی کی تصانیف حسام الحرمین اور الدولة المکیہ میں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں علمائے مصر و شام اور بغداد کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ حسام الحرمین اور الدولة المکیہ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے جید علما و فقہا فاضل بریلوی کی شان میں کس طرح رطب اللسان اور مدح خواں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سفرحج اور تصانیف سے متعلق نزهة الخواطر (الجزا الثامن) کے تکملہ ص۳۹ پر جناب ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں :۔

وسافر الی الحرمین الشریفین عدة مرات و ذاکر علماء الحجاز فی بعض المسائل الفقهیه والعلامیه والّف لبعض الرسائل اثناء اقامته بالحرمین واجاب عن بعض المسائل

التی عرضت علی العلماء الحرمین واعجبوا بغزارۃ علمہ وسعہ اطلاعہ علی المتون الفقھیہ والمسائل الخلافیہ وسرعہ تحریرہ وذکائہ ۔

کئی بار[1] حرمین شریفین کا سفر کیا اور علمائے حجاز سے بعض مسائل فقہیہ وکلامیہ میں مذاکرہ بھی کیا حرمین شریفین کے قیام کے زمانے میں بعض رسائل بھی لکھے اور علمائے حرمین نے بعض سوالات بھی کئے تو ان کے جواب کئی تحریر فرمائے متون فقہیہ اور اخلاقی مسائل میں ان کی ہمہ گیر معلومات سرعت تحریر اور ذہانت کو دیکھ کر سب کے سب حیران وششدر رہ گئے اسی کتاب کے ص۱۴۱ پر مزید لکھتے ہیں:

یندر نظیرہ فی عصرہ فی الاطلاع علی الفقہ الحنفی وجزئیاتہ یشھد بذالک مجموع فتاواہ وکتابہ "کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" الذی الفہ فی مکۃ سنۃ ثلاث وعشرین وثلاث مائۃ والف ۔

فقہ حنفی اور اس کے جزئیات پر ان کو (مولانا احمد رضا خاں) جو عبور حاصل ہے اس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے اور اس دعویٰ پر ان کا مجموعۂ فتاویٰ شاہد ہے نیز ان کی تصنیف "کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" جو انھوں نے ۱۳۲۳ھ میں مکہ معظمہ میں لکھی تھی ۔

قرآن حکیم کا اردو ترجمہ "کنز الایمان" اور "فتاویٰ رضویہ" کو فاضل بریلوی کے مرکزی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ ڈپٹی نذیر دہلوی کے

---

[1] فاضل بریلوی نے صرف دو بار حج کیا تھا ۔

ترجمہ کے بعد ۱۹۱۱ء میں فاضل بریلوی نے ادبی لغوی، با محاورہ اور سلیس اردو ترجمہ کر کے عظیم خدمت انجام دی ہے بقیہ سارے ترجمے فاضل بریلوی کے بعد ہی کئے گئے آج دنیا میں جہاں جہاں اردو داں طبقہ آباد ہے وہاں کنزالایمان ضرور پایا جاتا ہے فقہی کارناموں کے تحت بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل آپ کے فتاوے امت مرحومہ پر عظیم احسان کا درجہ رکھتے ہیں عرب و عجم کے بڑے سے بڑے علماء وفضلا نے فاضل بریلوی جیسا فقیہہ نہ دیکھا بقول ڈاکٹر اقبال، ان کی طبیعت میں شدت زیادہ تھی اگر یہ چیز درمیان میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خاں گویا اپنے دور کے امام ابو حنیفہ ہوتے (ص۱۰ مقالات یوم رضا حصہ سوم لاہور اپریل ۱۹۷۱ء از ڈاکٹر احمد عابد علی ڈی فل آکسفورڈ یونیورسٹی و مہتمم بیت القرآن لاہور)

فاضل بریلوی کے سلسلہ میں برسہا برس سے چند اعتراضات بھی کئے جاتے رہے اور بدگمانیاں پھیلائی جاتی رہی ہیں جنکی نہ کوئی بنیاد ہے نہ اصل محض ہوائیں مخالفت کا سلسلہ جاری ہے سب سے نمایاں اعتراض یہ ہے کہ وہ تکفیر مسلم میں بہت جلد باز واقع ہوئے تھے جب کہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں دیجلی الصوت لنھی الدعوۃ امام الموت" کے ص۲ پر فاضل بریلوی فرماتے ہیں " لزوم و التزام میں فرق ہے اقوال کا کلمہ کفر ہونا اور بات اور قائل کو کافر مان لینا اور بات، ہم احتیاط برتیں گے سکوت کریں گے جب تک ضعیف سے ضعیف احتمال ملے گا حکم کفر جاری کرتے ڈرین گے۔"

الغرض فاضل بریلوی قدس سرہٗ کی سمندر کی طرح پھیلی ہوئی دینی وعلمی خدمات چاند تاروں کی مانند ہمیشہ چمکتی رہیں گی عرب و عجم کے بے شمار ممتاز علماء، فضلا، فقہا، دانشوروں نے آپ کی تبحر علمی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا آپ کی عظیم روحانی شخصیت اور کم و بیش ۸۷ علوم و فنون کے اعتراف میں سیکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئیں، ہزاروں مضامین لکھے گئے اور ہند و پاک کے مختلف اداروں کی جانب سے اب تک پچاسوں ضخیم نمبر شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ہند و پاک اور دنیا کی متعدد معیاری یونیورسٹیوں میں پی۔ایچ۔ڈی کے لئے تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے۔

مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی ایک عظیم مفسر، محدث، فقیہہ، منطقی، فلسفی اور ریاضی داں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عہد ساز، مایہ ناز اور بلند پایہ شاعر بھی تھے نعتیہ شاعری کے ماہر تھے مسلم الثبوت استاد تھے جن کی مہارت و استادی نے اردو نعتیہ شاعری میں انقلاب پیدا کیا محسن و امیر نے اگر نعتیہ شاعری کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کیا تو حضرات رضا و حسن نے پوری صدی پر بھاری کر دیا۔ کوئی نہ کوئی صنف ادب ہر دور میں امتیازی شان کے ساتھ فروغ پاتی رہی ہے۔ بیسویں صدی میں اردو نعتیہ شاعری کی معراج ہوئی اور حب رسول کا غیر معمولی فنی سرمایہ انسانی و تہذیبی ادب کی آبرو بن کر رہ گیا۔ حضرت رضا اگرچہ بنیادی طور پر نثر نگار تھے اور شعر و سخن کو ہمیشہ ضمنی مشغلہ سے تعبیر کرتے تھے مگر ان کا یہ ضمنی مشغلہ بھی ایسا رنگ لایا کہ جس نے دنیائے شعر و سخن میں ہلچل مچا دی۔ ظاہر ہے جس نے ۵۵ علوم و فنون کا سمندر بہا کر رکھ دیا ہو اس کی ذکاوت و ذہانت اور وسعت نظری سے شاعری کا کوئی بھی حسن کیسے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔

نعتیہ شاعری جو حب رسول کے جذبے ابھارتی ہے، جو گناہ و معصیت کا احساس دلاتی ہے، جو بخشش و مغفرت کی التجا کرتی ہے اور جو سیرت حبیب خدا کا دیوانہ بناتی ہے، ایسی شاعری کی محفل میں ایک سچے عاشق رسول نے اپنی آواز کو منفرد بناتے ہوئے جن جن فنی ہیئتوں اور فکری پیکروں کا اضافہ کیا ہے ان کے سامنے نعتیہ شاعری

کا مزید دقار بلند ہوتا ہے نعت گوئی ایک مشکل ترین فن ہے اور اس مشکل ترین فن کو تہہ دار معنویت، لسانی بلاغت اور اجتہادی افکار کی دولتوں سے مالا مال کر دینا اور بھی مشکل کام ہو جاتا ہے مگر رضا بریلوی کی قوت متخیلہ، فکری منصب فنی بالیدگی، اور والہانہ عقیدت مندی کس وقت پل صراط سے گذر گئی اصحاب فن دیکھتے ہی رہ گئے اور ہر جانب سے مرحبا مرحبا کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

رضا پل سے اب وجد کرتے گذریئے
کہ ہے رب سلم صدائے محمدؐ

نعت گوئی ایک عبادت ہے وظیفۂ محبت ہے اور حسن عقیدت کا مودبانہ اظہار بھی جسے صفحات پر محفوظ کرنے کا فریضہ قلم ہی کو انجام دینا پڑتا ہے حضرت رضا کے مبارک جذبات جب نعت نویسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس تمنا کا پہلے اظہار کرنے لگتے ہیں۔ ؎

طوبیٰ میں جو سب سے اونچی نازک سیدھی نکلی شاخ
مانگوں نعت نبی لکھنے کو روح قدس سے ایسی شاخ

دربار رسالت آب کے نعت گو شعرا کی مقدس شاعری امت مرحومہ کے لئے مشعل راہ اور چراغ انسانیت بن کر سامنے آئی جنہوں نے منظوم خراج عقیدت کی ابتداء کر کے اصناف سخن پر احسان عظیم فرمایا ہے حضرت رضا کا شعری ذوق بھی سنت صحابہ اور تقلید اصفیاء ہی میں ظاہر ہوا اور بغیر کسی مشق و ریاض اور رہنمائی استاد کے ایام آغاز ہی سے اصحاب فکر و فن کو حیرت زدہ کرنے لگا پوری شاعری روحانی قدروں کی خوشبو پھیلا یا (تابانیوں)، قرآن و احادیث اور سیرت نبوی کے اجالے میں پروان چڑھی اور ایک سے ایک فکر و فن اور حسن آفرینی کا دریا بہاتی رہی اپنی ایک تمنا بھی یوں خود فرماتے ہیں

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ　　بے جا سے ہے المنۃ للہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی　　یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

احکام شریعت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے جمال و کمال اور عشق و محبت کی تجلیوں کے گن گانا ہی دراصل نعتیہ شاعری ہے ۔ محبت، خیر، صداقت، قربت اور قلبی وآگہی ہی اس کا مطمع نظر اور محور ہے آپ کی شاعری کے مصرع مصرع سے حبِ رسول کا سرچشمہ پھوٹا پڑتا ہے جذبات واحساس کی چمک پھوٹی پڑتی ہے جوش عقیدت اور مدح وثنا کا والہانہ انداز لئے ہوئے بہت سے اشعار کسی نہ کسی واقعہ و کردار سے وابستہ بھی دکھائی دیتے ہیں جنھیں اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ اس کے حقیقی پس منظر یا اصل اشارہ وکنایہ سے واقفیت نہ ہو اصل ہو شاعری میں یہ ایک ایسی بلیغ ذہانت اور تبحر علمی کا اظہار ہے کہ بڑے سے بڑے دانشور چکر کھا جاتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ جتنی عقیدت ومحبت اور علم وادب کی روشنی میں معیاری شاعری کی جا سکتی ہے اسی کی روشنی میں اس کا سمجھنا یا اس کی تہہ تک اترنا بھی ضروری ہے۔ فکر وفن، صنعت گری اور شعری محاسن کا اظہار اپنی جگہ مگر نعتیہ شاعری سے عشق رسالت کی بے ساختگی اور جذبۂ ایمانی کا جو مبارک نتیجہ نکلتا ہے وہی اس شاعری کا طرۂ امتیاز اور غرض وغائت ہے جس کا صرف ایک شعر دل کی گہرائیوں میں اتر جانے، دل کی دھڑکنیں تیز کرنے، آنکھوں کو اشکبار کرنے اور جذبات میں تلاطم پیدا کر دینے کے لئے بہت کافی ہوتا ہے نعتیہ شاعری کی قدروں پر حالات، وقت اور چڑھتے ڈوبتے سورج کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہ شاعری ہمیشہ ایک رنگ پر رہتی ہے البتہ اس میں وسعت کے لئے کوشش ضرور جاری رہتی ہے حضرت رضا کے عہد تک اگرچہ اردو نعتیہ شاعری اپنے فکر وفن، صنعت گری اور دیگر اوصاف ومحاسن کے اعتبار سے

کافی آگے بڑھ چکی تھی تاہم اس ہجوم میں ایک مخصوص جماعت کے باوجود نعتیہ شاعری کو ایک ترو تازہ رنگ و آہنگ اور کیف و سرور سے روشناس کرانا کوئی معمولی بات نہیں ۔

حضرت رضا بالخصوص نعتیہ غزلوں کے شاعر تھے انھوں نے نعتیہ غزلوں کو بعض نئی راہوں سے متعارف کرایا اور محاوروں کی بنیاد پر بعض اہم فنی ہیئتوں کا اضافہ کیا مثلاً آپ کی ایک نعت جس کا ہر شعر بیک وقت چار زبانوں یعنی عربی، فارسی، اردو اور ہندی کی امتزاجی لچک سے وابستہ ہے بہت خوب ہے پوری غزل فکری و فنی مہارت، لسانی ہم آہنگی اور پختہ کاری سے لبریز ہے کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ حضرت رضا کے بعد پھر اس نادر فن کی ترویج نہ ہو سکی چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

لم یات نظیرک فی نظر مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھ کو شہ دوسرا جانا
البحر علا والموج طغی من بیکس و طوفاں ہوش ربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا موری نیا پار لگا جانا
یا شمس نظرت الی لیلی چو بطیبہ رسی عرضے بکنی
توری جوت کی جھلجھل جگ میں رچی مری شب نے نہ دن ہونا جانا

بطور خاص اس غزل میں ہندی کی مختصر آمیزش کو ہندی ادب کی بڑی شاعری کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے اندازہ لگتا ہے کہ حضرت رضا کو ہندی یا علاقائی زبانوں میں کس قدر گہری مہارت حاصل تھی اس غزل کے علاوہ بھی ان کی شاعری میں ہندی زبان اور ہندی محاوروں کا خوب استعمال ہے۔ ویسے ایک زبردست عالم دین ہونے کی حیثیت سے آپ کی پوری شاعری میں عربی فارسی کا بے حد غلبہ ہے قرآن

واحادیث کے شہ پارے اور عربی جملوں کی کثیر شمولیت سے پورا دیوان جھلملاتا نظر آتا ہے جس کے پس منظر اور اصل مفہوم تک پہونچنا معمولی قاری کے بس سے باہر ہے۔ حضرت رضا کو بلتی پھرتی زبان سے کوئی دلچسپی نہیں محاوروں کے بلیغ استعمال کی روشنی میں فصاحت و بلاغت، ندرت تخیل، جدت تمثیل اور لطافت تشبیہات و استعارات نے شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اس کے علاوہ آپ نے اردو کی تقریباً تمام مروجہ بحروں میں شاعری کی ہے اور مخصوص و معروف صنعتوں کا جم کر مظاہرہ کیا ہے۔

مرزا غالب نے کہا تھا ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

میدان غزل میں اگر مرزا غالب اس دعوے میں حق بجانب ہیں تو دنیائے نعت میں حضرت رضا بھی اپنی مثال آپ ہیں، کہتے ہیں ؎

یہی کہتی ہے بلبل باغ جناں کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں
نہیں ہند میں واصف شاہ ہدیٰ مجھے شوخی طبع رضا کی قسم

حدائق بخشش کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت رضا نے دیوان غالب کا خصوصی مطالعہ کیا ہے وہ مرعوب تو نہیں مگر غالب کی شعری عظمت سے متاثر ضرور نظر آتے ہیں۔ حدائق بخشش میں ایسے کافی اشعار ہیں جنھیں غالب کی مخصوص ترکیبوں اضافتوں اور لفظی بندشوں کے ساتھ خیالات کی ہم آہنگی کا بھی پتہ چلتا ہے اور متعدد اشعار بالکل غالبانہ انداز و فضا میں کہے گئے ہیں (تفصیلات کے لئے دیکھئے مضمون مرزا غالب اور شاہ احمد رضا۔ از سید شمیم گوہر" مطبوعہ ماہنامہ قاری دہلی جون ۱۹۸۹ء)

تغزل کی داخلی تحریک اور جمالیاتی میلان کے خمیر سے کوئی شاعری انکار نہیں کر سکتی۔ یہ وابستگی خواہ براہ راست ہو یا بالواسطہ، اس کے اظہار کی علامات کو چھپایا نہیں جا سکتا تغزل اور موسیقیت شاعری کی سب سے بڑی میراث ہے حضرت رضا اگرچہ خالص نعت کے شاعر ہیں اور ساری شاعری ایمانی تصورات و تخیلات اور حب رسول میں رچی بسی ہے تاہم تغزلی عنصر کے پیش نظر نعت کے اندر جمالیاتی مہک، جذباتی چبھن، لطیف کسک اور سوز و گداز کو اس طور پر شامل کر دینا کہ ایک مصرع بھی فکری قباحتوں اور معنوی خباثتوں کا شکار نہ ہونے پائے بڑے کمال کی بات ہے میدان نعت میں اتنی کثرت سے رنگ تغزل کے استعمال میں بڑا سے بڑا شاعر پیچھے رہ گیا حضرت رضا کے یہ اشعار ایسے بھی نہیں جو محض ردایت نوازی اور ذوق شعری کو تسکین پہونچانے کے مرادف ہوں بلکہ اس بہانے تغزل کو مہذب بنانے میں حضرت رضا نے نمایاں فریضہ انجام دیا ہے جس کا اندازہ ان کی پوری شاعری سے لگایا جا سکتا ہے۔ احساس و جذبات کی اس امتزاجی کیفیت نے حدائق بخشش کو ممتاز بنا دیا۔

حضرت رضا بریلوی کے شعری مجموعہ کا نام "حدائق بخشش" ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے تیسرا حصہ غیر معتبر اور ساقط الاعتبار ہے غیر تحقیقی طور پر کسی دوسرے رضا نام کے شاعر کا کلام یکجا کر کے حضرت رضا سے منسوب کر دیا گیا اور حدائق بخشش حصہ سوم کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ حصہ سوم کے غیر معتبر ہونے کے باوجود چند کلام واقعی حضرت رضا بریلوی کے ہیں مگر محققین نے ابھی چونکہ حوالہ کے ساتھ اس تحقیق کی وضاحت نہیں کی ہے اس لئے یہ راقم بھی خاموش ہے۔

حضرت رضا کی جملہ شاعری کا تجزیہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ نعتیہ غزل قصائد

اور مناقب سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے غزلوں کی تعداد زیادہ ہے اور دونوں حصوں میں بکھری ہوئی ہیں غزل کے بعد ان کی حسن آفرینی قصیدے میں نظر آتی ہے قصیدے کا انداز پوری شاعری پر چھایا ہوا ہے چند قصائد نے اپنے فکر و فن ہیئت و تکنیک، لطافت و نزاکت، پختگی و سنجیدگی اور سلاست و روانی کی روشنی میں بے پناہ شہرت پائی ہے جن میں قصیدۂ نوریہ، قصیدۂ درودیہ، قصیدۂ سلامیہ اور قصیدۂ معراجیہ نہ صرف اہمیت و عظمت کے حامل ہیں بلکہ اردو کی نعتیہ شاعری کے سرخیل اور قیمتی یادگار ہیں۔ بالخصوص قصیدۂ درودیہ کے ہر شعر کے پہلے مصرع کا آخری حرف حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے یہ اجتہادی فنی تشکیل صنعتوں کی محفل میں اہمیت کی حامل ہے اور عظیم شعری رفتار کے باوجود یہ صنعت ابھی بھی اپنی ترویج سے محروم ہے چار اشعار ملاحظہ کیجئے۔

کعبہ کے بدر الدجیٰ تم پہ کروڑوں درود ۔۔۔ طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

ذات ہوئی انتخاب وصف ہوئے لاجواب ۔۔۔ نام ہوا مصطفےٰ تم پہ کروڑوں درود

تم سے جہاں کی حیات تم سے جہاں کی ثبات ۔۔۔ اصل سے ہے ظل بندھا تم پہ کروڑوں درود

تم ہو حفیظ و مغیث کیا ہے وہ دشمن خبیث ۔۔۔ تم ہو تو پھر خوف کیا تم پہ کروڑوں درود

ان قصیدوں کے علاوہ چند قصائد اردو فارسی میں حضرت سیدنا مولا علی، حضرت سیدنا غوث اعظم، حضرت ابوالحسین احمد نوری، اور حضرت اچھے میاں صاحب وغیرہم (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی شان میں بھی ہیں اور اسی قدر مناقب بھی۔ مناقب استمدادیہ کی تعداد زیادہ ہے۔ سب سے زیادہ قصائد و مناقب حضرت غوث اعظم کی شان میں ہیں جو اردو فارسی دونوں زبانوں میں ہیں بالخصوص حصۂ دوم کے آخر میں یہ شان غوث اعظم جو رباعیاں ہیں وہ فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں ان رباعیوں کی ردیفوں کو حروف تہجی کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ سلسلہ عالیہ قادریہ کا

منظوم شجرہ بھی مجموعہ کے حصہ اول میں شامل ہے جو بہت مشہور ہے. مطلع یہ ہے ؎

یا الٰہی رحم فرما مصطفےٰ کے واسطے
یا رسول اللہ کرم کیجے خدا کے واسطے

حدائق بخشش کے حصہ دوم میں مختلف اصناف پر پچیسوں فارسی کلام ہیں جن سے فارسی زبان و ادب میں حضرت رضا کی مہارت اور ریختہ کاری کا اندازہ ہوتا ہے مجموعہ میں صرف ایک فارسی مثنوی ہے جو" ردامثالہ" کے عنوان سے ۹۸ اشعار پر مشتمل ہے آپ عربی شاعری میں بھی بے پناہ مہارت اور کمال و قدرت رکھتے تھے باقاعدہ پورے دیوان کی خبر ہے مگر ہنوز اس کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ ضائع ہو گیا یا کسی کے پاس محفوظ ہے حضرت رضا کی مہارت عربی ادب کا اندازہ ان کے" قصیدتان رائعتان" کے مطالعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ قصیدتان رائعتان کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے جس میں ۳۱۳ اشعار ہیں اس کے علاوہ ڈاکٹر حامد علی خاں نے اپنی تحقیق کے مطابق حضرت رضا کی تصانیف اور دیگر کتب و رسائل سے تین سو نوے مطبوعہ اشعار کا پتہ لگایا ہے جو مختلف صنفوں اور متعدد ہیئتوں سے متعلق ہیں۔

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلّم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں

چنانچہ غزل، قصیدہ، منقبت، اور رباعی کے علاوہ حضرت رضؔا تاریخ گوئی میں بھی بے حد مہارت رکھتے تھے۔ اس موضوع پر بھی باقاعدہ تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے اس مختصر مضمون میں اس ذکر کی گنجائش نہیں الغرض ان جملہ کمالات و محاسن کے باوجود ایک سچے عاشقِ رسول اور ثنا خوانِ حبیبِ خدا نے اپنی شاعری کو عبادت و وظیفہ کے سوا اور کچھ نہ سمجھا کس انکسار کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

ثنائے سرکار ہے وظیفہ قبول سرکار ہے تمنّا
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا، ردی تھی کیا کیسے قافیے تھے

نمونۂ کلام

— (۱) —

لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِی نَظَرٍ مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھ کو شہِ دوسرا جانا

البحر علا والموج طغٰی من بیکس و طوفاں ہوشربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا موری نیا پار لگا جانا

یا شمس نظرت الٰی لیلی چو بطیبہ رسی عرضے بکنی
توری جوت کی جھلجھل جگ میں رچی مری شب نے نہ دن ہونا جانا

لَکَ بَدْرٌ فِی الوجہ الاَجْمل خط ہالۂ مہ زلف ابر اجل
تورے چندن چندر پرکنڈل رحمت کی بھرن برسا جانا

اَنَا فِی عَطَشٍ وَّ سخاکَ اَتَمْ اے گیسوئے پاک اے ابرِ کرم
برسن ہارے رم جھم رم جھم دو بوند ادھر بھی گرا جانا

یَا قَافِلَتِی زِیْدِیْ اَجَلَکْ رحمے بر حسرت تشنہ لبک
مورا جیرا لرجے درک درک طیبہ سے ابھی نہ سنا جانا

وَاھًا لِسُوَیْعَاتٍ ذَھَبَتْ آں عہدِ حضور بار گہت
جب یاد آوت موہے کر نہ پرت دردا وہ مدینہ کا جانا

اَلْقَلْبُ شَجٍ وَّالْھَمُّ شُجُوْن دل زار چناں جاں زیر چنوں
پت اپنی بپت میں کا سے کہوں مرا کون ہے تیرے سوا جانا

الروح فداک فزد حرقاً اک شعلہ دگر بر زن عشقا
مورا تن من دھن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا
بس خامۂ خام نوائے رضاؔ نہ یہ طرز مری نہ یہ رنگ مرا
ارشاد احبا ناطق تھا ناچار اس راہ پڑا جانا

(۲)

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفےٰ کہ یوں
کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں
قصرِ دنیٰ کے راز میں عقلیں تو گم ہیں جیسی ہیں
روحِ قدس سے پوچھئے تم نے بھی کچھ سنا کہ یوں
میں نے کہا کہ جلوۂ اصل میں کس طرح گمیں
صبح نے نور مہر میں مٹ کے دکھا دیا کہ یوں
ہائے رے ذوقِ بیخودی دل جو سنبھلنے سا لگا
چھک کے مہک میں پھول کی گرنے لگی صبا کہ یوں
دل کو دے نور و داغِ عشق پھر میں فدا دو نیم کر
مانا ہے سن کے شقِ ماہ آنکھوں سے اب دکھا کہ یوں
جو کہے شعر و پاسِ شرع دونوں کا حسن کیوں کر آئے
لا اسے پیشِ جلوۂ زمزمۂ رضاؔ کہ یوں

— (۳) —

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں
یادِ حضور کی قسم غفلتِ عیش ہے ستم

خوب ہیں قیدِ غم میں ہم کوئی ہمیں چھڑائے کیوں
جان ہے عشقِ مصطفےٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اٹھائے کیوں
یا تو یونہی تڑپ کے جائیں یا وہی دام سے چھڑائیں
منتِ غیر کیوں اٹھائیں کوئی ترس جتائے کیوں
جانِ سفر نصیب کو کس نے کہا مزے سے سو
کھٹکا اگر سحر کا ہو شام سے موت آئے کیوں
اب تو نہ روک اے غنی عادت سگ بگڑ گئی
میرے کریم پہلے ہی لقمۂ تر کھلائے کیوں
سنگِ درِ حضور سے ہم کو خدا نہ صبر دے
جانا ہے سر کو جا چکے دل کو قرار آئے کیوں
ہے تو رضا نرا ستم جرم پہ گر لجائیں ہم
کوئی بجائے سوزِ غم سازِ طرب بجائے کیوں

— (۴۳) —

یادِ وطن ستم کیا دشتِ حرم سے لائی کیوں
بیٹھے بٹھائے بد نصیب سر پہ بلا اٹھائی کیوں
دل میں جو چوٹ تھی دبی ہائے غضب ابھر گئی
پوچھو تو آہِ سرد سے ٹھنڈی ہوا چلائی کیوں
نام مدینہ لے دیا چلنے لگی نسیمِ خلد
سوزشِ غم کو ہم نے بھی کیسی ہوا بتائی کیوں
کس کی نگاہ کی حیا پھرتی ہے میری آنکھ میں

نرگسِ مست نازنے مجھ سے نظر چرائی کیوں
حورِ جناں ستم کیا طیبہ نظر میں پھر گیا
چھیڑ کے پردۂ حجاز دیس کی چیز گائی کیوں
عرض کروں حضور سے دل کی تو میرے خیر ہے
پیٹتی سر کو آرزو دشت حرم سے آئی کیوں
حسرت لو کا سانحہ سنتے ہی دل بگڑ گیا
ایسے مریض کو رضاؔ مرگِ جواں سنائی کیوں

(۵)

رخ دن ہے یا مہر سما یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
شب زلف یا مشکِ ختا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
ممکن میں یہ قدرت کہاں واجب میں عبدیت کہاں
حیراں ہوں یہ بھی ہے خطا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
حق یہ کہ ہیں عبداللہ اور عالم امکاں کے شاہ
برزخ ہیں وہ سرِّ خدا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
خورشید تھا کس زور پر کیا بڑھ کے چمکا تھا قمر
بے پردہ جب وہ رخ ہوا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
ڈر تھا کہ عصیاں کی سزا اب ہوگی یا روزِ جزا
دی ان کی رحمت نے صدا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
کوئی ہے نازاں زہد پر یا حسنِ توبہ ہے سپر
یاں ہے فقط تیری عطا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
دن لہو میں کھونا تجھے شب صبح تک سونا تجھے

شرم نبی خوف خدا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
ہے بلبل رنگیں رضاؔ یا طوطیٔ نغمہ سرا
حق یہ کہ واصف ہے ترا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

---

(۶)

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمھاری واہ واہ
قرض لیتی ہے گنہ پرہیز گاری واہ واہ

خامۂ قدرت کا حسن دست کاری واہ واہ
کیا ہی تصویر اپنے پیارے کی سنواری واہ واہ

اشک شب بھر انتظار عفو امت میں بہیں
میں فدا چاند اور یوں اختر شماری واہ واہ

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر
ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ

نور کی خیرات لینے دوڑتے ہیں مہر و ماہ
اٹھتی ہے کس شان سے گرد سواری واہ واہ

نیم جلوے کی نہ تاب آئے قمر ساں تو سہی
مہر اور ان تلوؤں کی آئینہ داری واہ واہ

نفس یہ کیا ظلم ہے جب دیکھو تازہ جرم ہے
ناتواں کے سر پہ اتنا بوجھ بھاری واہ واہ

مجرموں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے رحمت کی نگاہ
طالع برگشتہ تیری سازگاری واہ واہ

خود رہے پردے میں اور آئینہ عکس خاص کا
بھیج کر انجانوں سے کی راہ داری واہ واہ

صدقے اس انعام کے قربان اس اکرام کے
ہو رہی ہے دونوں عالم میں تمھاری واہ واہ

پارۂ دل بھی نہ نکلا دل سے تحفے میں رضاؔ
ان سگان کو سے اتنی جان پیاری واہ واہ

حضرت حسن رضا خاں بریلوی

حضرت حسن خاں بریلوی، حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے چھوٹے بھائی تھے ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ تاریخ پیدائش ہے۔ ایک روایت ۴ ربیع الاول کی بھی ملتی ہے جد امجد حضرت علامہ رضا علی خاں کو ولادت کی خبر دی گئی تو اظہار مسرت کرتے ہوئے فرمایا "یہ میرا بیٹا مست ہوگا" قول بالکل سچ ثابت ہوا عشق رسالت میں ڈوبی ہوئی اپنی نعتیہ شاعری سے حضرت حسن خود بھی مست ہوئے اور دوسروں کو بھی مست اور بیخود کرتے رہے۔ تعلیم و تربیت والد بزرگوار حضرت علامہ نقی علی خاں اور برادر اکبر حضرت فاضل بریلوی سے حاصل کی عالمانہ شان و عظمت کے حامل تھے اور شعر و سخن سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ بیعت حضرت مولانا سید ابوالحسین احمد نوری علیہ الرحمہ مارہروی سے تھی۔ فاضل بریلوی کی ایماء پر قائم ہونے والے مشہور تعلیمی ادارہ مدرسہ منظر اسلام کا تاریخی نام حسن بریلوی ہی نے تجویز کیا تھا اور آپ ہی اس مدرسہ کے پہلے مہتمم بھی مقرر کیے گئے۔ محلہ کسگران بریلی میں "مطبع اہل سنت و جماعت" آپ ہی نے قائم کیا تھا جس میں آپ کی متعدد تصانیف طبع ہوئیں۔ ایک شعری گلدستہ "بہار بے خزاں" اور ایک ہفتہ وار اخبار "روز افزوں" کے بھی آپ ہی نگراں تھے جنہیں آپ کے تلامذہ میر محمود علی عاشق اور محمد بریلوی نکالتے تھے۔ حضرت حسن بریلوی کی نثری و شعری تصانیف کی تعداد گیارہ ہے جن میں ثمر فصاحت

(مجموعۂ تغزل)، ذوق نعت (مجموعہ نعت) اور نگارستان لطافت (رسالہ میلاد) کو خوب شہرت ملی بالخصوص "ذوق نعت" کی قابل قدر فصاحت و عظمت کو دنیائے نعت میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہوئی۔ ذوق نعت کے اب تک بچیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ متعدد ایڈیشن پاکستان میں بھی اشاعت پذیر ہوئے۔ قابل قدر تصنیف "ثمر حسن" مصنفہ جناب نظیر لدھیانوی مطبوعہ رضا پبلیکیشنز لاہور سنہ ۱۹۷۸ء کے آغاز میں بعنوان تقدیم محمد مرید احمد چشتی، حسن بریلوی کی جملہ تصانیف کی اسطرح وضاحت کرتے ہیں۔

(۱) تزک مرتضوی در اثبات تفضیل شیخین (۲) نگارستان لطافت در ذکر میلاد شریف (۳) بے موقع فریاد کا مہذب جواب اثبات مسئلہ قربانی (۴) آئینۂ قیامت ذکر واقعہ کربلا (۵) دین حسن حقانیت اسلام در رد (۶) وسائل بخشش مثنوی (۷)، ذوق نعت معروف بہ صلۂ آخرت (۸)، ثمر فصاحت (۹)، قند فارسی کلام مجاز فارسی (۱۰) صمصام حسن بر دابر فتن (۱۱)، ندوہ کی روداد سوم کا نتیجہ رد ندوہ۔

شاعری کی ابتدا عموماً عشقیہ و مجازی ہی محرکات کی روشنی میں ہوتی ہے حضرت حسن بریلوی کا شعری سفر بھی مجازی رنگ و آہنگ سے شروع ہوا۔ اس وقت استاد داغ دہلوی کی شاعری و استادی کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی حسن بریلوی کی نظر انتخاب بھی داغ پر گئی اور ایک سال تک رامپور میں رہ کر حضرت داغ سے استفادہ کیا اور ان کی شاگردی اختیار کی لیکن مصنف خمخانۂ جاوید لالہ سری رام لکھتے ہیں "جس زمانے حضرت داغ رامپور میں تھے آپ ان کے شاگرد ہوئے اور ہر سال ایک دو مہینے ان کی خدمت میں رہ کر صحبت سے مستفیض ہوتے رہے (جلد دوم صفحہ ۴۵) شاعری کی ابتدا چونکہ مجازی و رومانی

فضا میں ہوئی اسلئے حسن بریلوی نے داغ کی ضرورت محسوس کی ورنہ بقول مصنف "خمخانہ جاوید" نعت گوئی میں اپنے برادر بزرگ مولوی احمد رضا خاں صاحب سے مستفیض ہیں (ص ۵۰۴) حضرت فاضل بریلوی خود لکھتے ہیں "مولانا کافی اور حسن میاں مرحوم کا کلام اول سے آخر تک شریعت کے دائرے میں ہے ان کو میں نے نعت گوئی کے اصول بتا دیئے تھے۔ ان کی طبیعت میں ان کا ایسا رنگ رچا کہ ہمیشہ کلام اسی معیار اعتدال پر صادر ہوتا جہاں شبہ ہوتا مجھ سے دریافت کر لیتے۔" (الملفوظ حصہ دوم ص۱۱۴ مطبوعہ کراچی) ثابت ہوا کہ مجازی رنگ کے ساتھ ساتھ نعت گوئی سے بھی بالکل ابتدائی دلچسپی تھی ایسی صورت میں مصنف "خمخانہ جاوید" کا یہ کہنا کہ ہر سال ایک دو مہینے انکی خدمت میں رہ کر مستفیض ہوتے رہے" یہ تحقیق مبہم معلوم ہوتی ہے ہر سال کی وضاحت نہ ہونے کیا تو زیادہ سے زیادہ دو تین سال تک سلسلۂ استفادہ کا گمان کیا جاسکتا ہے یا پھر اس روایت پر بھی اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ وہ مستقل سال بھر تک استفادہ کرنے کے بعد رامپور سے لوٹے ہوں کیونکہ حضرت حسن یوں بھی برابر رامپور جاتے رہتے تھے ان کے اپنے پھوپھا جناب فضل حسن خاں صاحب راج دوارہ رامپور ہی میں رہتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ہر سفر استفادہ کے لئے نہیں ہوتا ہوگا یہ اور بات ہے کہ استاد داغ سے تعلقات اور رسم و راہ زیادہ دنوں تک بنے رہے ہوں کیوں کہ یہ مشہور واقعہ اسی زمانے کا ہے کہ حضرت حسن نے اپنے استاد مرزا داغ دہلوی کو جب اپنے بڑے بھائی حضرت رضا بریلوی کی نعت کا یہ مطلع سنایا ؎

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں　　　ترے دن اے بہار پھرتے ہیں

تو داغ پھڑک اٹھے اور تعریف کرتے ہوئے کہا "مولوی ہو کے ایسے اچھے شعر کہتا ہے" اس واقعہ کا ذکر اپنے ایک تاثراتی مضمون میں جناب ماہر القادری نے بھی کیا ہے (دیکھئے ماہنامہ فاران کراچی شمارہ ستمبر ۱۹۷۱ء ص ۴۴) مگر یہ حقیقت ہے کہ استاد داغ سے اصلاح و استفادہ کا سلسلہ اس قدر ضرور رہا کہ مجازی و رومانی شاعری کی ابتدا پختگی و بالیدگی تک پہنچی اور ثمر فصاحت کے نام سے باقاعدہ ان کا غزلیہ دیوان مرتب ہوا اور اس میدان میں بھی انہوں نے ایسے ایسے فکری و فنی جوہر دکھلائے کہ مجھے یہ کہنے میں

کوئی تکلف نہیں کہ ثمر فصاحت کے سیکڑوں اشعار اساتذۂ فن سے بہتر ہیں اور فکر و فن کے اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتے ہیں حضرت حسن کی پوری عشقیہ شاعری پر اپنے استاد کا رنگ غالب ہے اسلوب اور لب و لہجہ بھی ملتا جلتا ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

اے حسنؔ شاگردوں میں داغ سے استاد کا
کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذت سوز و گداز

مگر گھر کے مذہبی ماحول نے ایسی عشقیہ شاعری کا سلسلہ زیادہ دنوں تک چلنے نہیں دیا اور پھر حضرت حسن اپنے برادر بزرگ کی ڈگر اپناتے ہوئے نعتیہ شاعری کی طرف ایسا راغب ہوئے کہ پھر تا دم آخر نعت رسول ہی کی عبادت میں مصروف رہے۔ حسن بریلوی کا دیوان "ذوق نعت" نعتیہ شعر و ادب کا قیمتی گنجینہ اور فکری کاوشوں کا لاجواب تحفہ ہے ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا اور حضرت فاضل بریلوی نے قطعۂ تاریخ طباعت کہہ کر خراج تحسین پیش کیا۔

حسن رضا باد بریں سلام
نعت حسن آمدہ نعت حسن
انّ من الشعر لحکمۃ تمام
انّ من الذوق لسحر ہمہ

کلک رضا داد چناں سال آں
یافت قبول از شہ راس الانام ۱۳۲۶ھ

ذوق نعت میں حمد، مسدس، نعتیہ غزل، سلام، منقبت، قصیدہ، مثنوی، شہادت نامہ، رباعی اور قطعہ سب کچھ موجود ہے ان کا ضخیم نعتیہ دیوان ہر صنف سخن کی طبع آزمائی اور فنی عظموں سے معمور نظر آتا ہے مگر وہ بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر تھے ان کے بعض قابل قدر جدید ہیئتی تجربوں اور فنی پیکروں نے دنیائے نعت کو ایک دور رس ذریں سے روشناس کرایا ہے۔ چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں حضرت رضا بریلوی کے بعد حسن بریلوی ہی وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے کئی اعتبار سے نعتیہ شعر و ادب کی زلفیں سنواریں وسیع امکان پیدا کئے اور ساتھ ہی معنی خیزی، مضمون آفرینی اور فکری بلندیوں کی تابانیوں سے مجلّٰی کر کے اپنی آواز کو ممتاز بنایا جس کے تحت یہ حقیقت سامنے آئی کہ حسن بریلوی کی عظیم نعتیہ شاعری اصحاب فکر و فن کے لئے مشعل راہ بنی ذوق شعری کو ایمان افروز حوصلوں

کی تاریخ میں کس طرح تپایا جا سکتا ہے ایسے حوصلہ شناسوں میں حسن بریلوی کا بڑا انفرادی مقام ہے وہ اگر ایک طرف عظمت رسالت، اظہار معصیت، التجائے مغفرت اور احساس ندامت جیسے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی شاعری کا حق ادا کرتے ہیں تو دوسری طرف عمیق معنویت، فنی تہہ داری، فصاحت و بلاغت اور لطیف طرز اسلوب پر بھی خصوصی زور دیتے ہیں۔ قدم قدم پر منصب رسالت کی رعایت نزاکت و نفاست اور شرعی احتیاط و پابندی کے باوجود آزاد فکروں کو متاثر کر دینے والی فنی بلاغتوں اور فکری کاوشوں کے قیمتی موتی بکھیر دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا مگر کچھ کر گذر جانے کے ایمانی حوصلے نے حسن بریلوی کو ہر اعتبار سے سرخرو کیا اور وہ کا کوئی بھی عظیم نعت گو ہو حضرت حسن نہ کسی سے مرعوب ہوتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی کسی شاعر کے سامنے ان کا شعری وقار ہلکا دکھائی دیتا ہے ان کی شاعری قرآن و احادیث، تاریخ و سیر، واقعات و کردار اور تہذیبی عوامل کی ترجمانی سے منور ہے اور پورا دیوان عشق و محبت میں رچے بسے اور مہکتے اشعار سے معطر ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے رخسار پر ڈھلکے ہوئے سارے آبگینے ان کے دیوان کے صفحات پر بکھر کر رہ گئے ہوں نعت گوئی کو انہوں نے ایک فریضہ ایک عبادت کے طور پر اپنایا اور جذبہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے الشعراء تلامیذ الرحمٰن کی صف میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ گنبد خضری کی بھینی بھینی چھاؤں میں دم بھرتا ہوا حضرت حسن کا بے لوث عشق، عظمت حبیب کردگار کو کس والہانہ انداز میں بیان کرتا ہے چند اشعار ملاحظہ کیجئے

دکھائی جائے گی محشر میں شان محبوبی ۔۔۔ کہ آپ ہی کی خوشی آپ کا کہا ہوگا

عزیز بچے کو ماں جس طرح تلاش کرے ۔۔۔ خدا گواہ یہی حال آپ کا ہوگا

جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعل پاک رسول
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں

ہوا دل سوختہ کو چاہئے تھی ان کے دامن کی یہ الٰہی صبح محشر کا گریباں چاک ہو جاتا

حسن بریلوی کی شاعری میں مضمون آفرینی کا وقار بہت اعلیٰ ہے اور ان کی شاعری کا یہ وصف نمایاں اور اہم ہے داخلی محرکات و کوائف میں غضب کی بے ساختگی ہے وہ تقدس مآب مشاہدات و تخیلات کو ترتیب دیکر بڑی آسانی سے اشعار کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں آورد کی زور آزمائی سے مبرّا ان کے جذبات میں ہر جگہ آمد آمد کا بہاؤ ہے۔ اس جذباتی بہاؤ نے اپنی قدر و قیمت کو کہیں بھی ہلکا نہیں ہونے دیا۔ انتخاب الفاظ یا شوکت الفاظ کی آب و تاب کے ساتھ ساتھ استعارہ و کنایہ اور تمثیلات و تشبیہات کی جلوہ گری بھی ان کی شعری عظمتوں میں اضافہ کرتی ہے زبان و بیان اگرچہ صاف و سلیس ہے مگر فارسی و عربی کی آمیزش کا زور ایک نئی کیفیت و معیار کا تعین کرتا ہے اس کے علاوہ مشکل سے مشکل زمین کو آسان بنا کر اعلیٰ افکار و تخیلات کی دولت سے نواز دینا یہ بھی حسن بریلوی کی پختہ کاری کا نمایاں ثبوت ہے۔ محاوروں کے ماہرانہ استعمال پر تو گویا انھیں مہارت حاصل تھی ویسے جدت نوازی اور معنوی آفرینی ان کی شاعری کا سب سے قیمتی جوہر ہے جو عشق رسالت کی تابانیوں سے مجلّٰی ہے چنانچہ ان جملہ گری دبنیادی اوصاف محاسن کی روشنی میں انہوں نے اپنے شعری و فنی منصب کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور نعتیہ شعر و ادب کے دامن کو وسیع کرنے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۲ء میں مجھے انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں معروف محقق قاضی عبدالودود نے کہا تھا کہ "حسن بریلوی نعت کے بہترین شاعر تھے انہوں نے حضرت حسن کے دو اشعار سنانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ رضا بریلوی صاحب بھی نعت کے اچھے شاعر تھے" اس تاثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عبدالودود جیسے مشہور و معروف محقق اور ادیب اپنے دل میں حضرت رضا اور حضرت حسن کے نعتیہ فکر و فن کی کتنی قدر و قیمت رکھتے تھے۔ نعتیہ غزلوں کے علاوہ یہی فنی کیفیت دیگر اصناف سخن میں بھی سلامت نظر آتی ہے

مثلاً مسدس ذکر معراج اور نغمۂ روح "قصیدۂ سائل بخشش" اور مثنوی ولادت حضور سرور میں ان کی زور بیانی، فکر آفرینی اور سلاست و روانی پوری طرح نکھری دکھائی دیتی ہے انہیں شعری محاسن سے "شہادت نامہ" سلام اور مناقب بھی آراستہ ہیں ان کے متعدد مناقب شعری حسن اور عظمتوں کے حامل ہیں گویا حضرت حسنؔ جس صنف سخن کی طرف بھی ملتفت ہوئے اپنی پختہ کاری، بالغ نظری، دیدہ وری اور تلاش و جدت کی غیر معمولی چھاپ چھوڑ گئے۔ ذوق نعت میں کمزور اور ڈھیلے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔

آپ زیارت حرمین شریفین کی آرزو میں ہمیشہ تڑپتے رہے۔ فرماتے ہیں ؎

جانے والے چل دیئے ہم رہ گئے اپنی اپنی اے حسنؔ تقدیر ہے

اللہ تعالیٰ نے ان کی دیرینہ آرزو پوری کی اور وفات سے ایک سال قبل مناسک حج اور زیارت گنبد خضریٰ سے مشرف ہوئے دو روایات کے مطابق ۲۲ رمضان المبارک یا ۳ شوال المکرم ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء کو وفات ہوئی نور اللہ مرقدہٗ۔ "شعر حسن" میں مرید احمد چشتی نے حضرت حسن کے جن تلامذہ کا ذکر کیا ہے ان کے اسماء یہ ہیں حکیم سید برکت علی نامیؔ، منشی دلدار علی بیدارؔ، شاہ حلمؔ بریلوی، حافظ دہاج احمد محشرؔ، سید محمود علی عاشقؔ، منشی ہدایت یار خان قیسؔ، منشی اختر حسین اخترؔ، منشی برج موہن کشور فیروزؔ، منشی مظہر حسین منظہرؔ، حکیم سید مسعود غوث فیضؔ، منشی تہور علی تہورؔ، منشی محمد حسین اثرؔ بدایونی اور منشی اعجاز احمد قیصرؔ مرادآبادی وغیرہم ص ۸ لیکن ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیبؔ کی تصنیف "تذکرۂ نعت گویان بریلی" کے مطالعہ سے جن تلامذہ کا ذکر ملتا ہے وہ مرید چشتی کی فہرست سے بالکل مختلف ہے تعجب ہے کہ تلامذہ حسنؔ کی تحقیق میں اتنا فرق کیوں ہوا۔ ادیبؔ نے مندرجہ ذیل تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ حکیم سید برکت علی نامیؔ، جمیل الرحمن جمیلؔ بریلوی، سید محمد فدا علی وامقؔ، محمد ضیاء اللہ خاں

ضیا ہیں، حافظ ارشاد علی ارشاد اور حمید اللہ خاں حمید داماد حسن بریلوی، ان تلامذہ میں حضرت جمیل بریلوی (متوفی ۱۳۴۳ھ) کی حیثیت بہت اہم اور موقر ہے۔ نعتیہ شعر و ادب کے فروغ میں ایک اہم ستون سمجھے جاتے ہیں " قبالۂ بخشش " کے نام سے ایک ضخیم نعتیہ دیوان ۱۳۴۱ھ میں شائع ہو چکا ہے جو فکر و فن، عشق و محبت اور زبان و بیان کا قیمتی یادگار تحفہ ہے۔

نمونۂ کلام

نہ ہو آرام جس بیمار کو سارے زمانے سے
اٹھا لے جائے تھوڑی خاک انکے آستانے سے

کوئی فردوس ہو یا خلد ہو ہم کو غرض مطلب
لگایا اب تو بستر آپ ہی کے آستانے سے

تمھارے تو وہ احساں اور یہ نافرمانیاں اپنی
ہمیں تو شرم سی آتی ہے تم کو منہ دکھانے سے

بہار خلد عاشق ہو رہی ہے روئے عاشق پر
کھلی جاتی ہیں کلیاں دل کی تیرے مسکرانے سے

زمیں تھوڑی سے دیدے بہر مدفن اپنے کوچے میں
لگا دے میرے پیارے میری مٹی بھی ٹھکانے سے

پلٹتا ہے جو زائر اس سے کہتا ہے نصیب اسکا
ارے غافل قضا بہتر ہے یاں کے پھر کے جانے سے

تمھارے در کے ٹکڑوں سے پڑا پلتا ہے اک عالم
گذارا سب کا ہوتا ہے اسی محتاج خانے سے

نہ پہنچے ان کے قدموں تک نہ کچھ حسن عمل ہی ہے
حسن کیا پوچھتے ہو ہم گئے گذرے زمانے سے

— (۲) —

کہوں کیا حال زاہد وادئ طیبہ کی نزہت کا
کہ ہے خلد بریں چھوٹا سا ٹکڑا میری جنت کا

بلاتے ہیں اسی کو جسکی بگڑی وہ بناتے ہیں
کمر بندھنا دیار طیبہ کو کھلنا ہے قسمت کا

نکیرو سوالے محشر واسطہ محبوب کا یارب
یہ مجرم دور سے آیا ہے سن کر نام رحمت کا

مرادیں مانگنے سے پہلے ملتی ہیں مدینہ میں
ہجوم جود نے روکا ہے بڑھنا دست حاجت کا

شب اسریٰ ترے جلوے نے کچھ ایسا سماں باندھا
کہ اب تک عرش اعظم منتظر ہے تیری رجعت کا

یہاں کے ڈوبتے دم میں ادھر جا کر ابھرتے ہیں
کنارا ایک ہے نہر ندامت بحر رحمت کا

غنی ہے دل بھرا ہے نعمت کونین سے دامن
گدا ہوں میں فقیر آستانِ خود بدولت کا

الٰہی بعد مردن پردہائے حائل اٹھ جائیں
اجالا میرے مرقد میں ہو ان کی شمع قربت کا

سنا ہے روز محشر آپ ہی کا منھ تکیں گے سب
کہاں پورا ہوا مطلب دل مشتاق رویت کا

ہمیں بھی یاد رکھنا ساکنان کوچۂ جاناں
سلام شوق پہنچے بیکسانِ دست غربت کا

حسنؔ سرکار طیبہ کا عجب دربار عالی ہے
در دولت پہ اک میلا لگا ہے اہل حاجت کا

— (۳) —

نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں
لئے ہوئے یہ دل بیقرار ہم بھی ہیں

ہمارے دست تمنا کی لاج بھی رکھنا
ترے فقیروں میں اے شہریار ہم بھی ہیں

ادھر بھی توسن اقدس کے دو قدم جلوے
تمہاری راہ میں مشت غبار ہم بھی ہیں

جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعل پاک رسول
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں

یہ کس شہنشہ والا کا صدقہ بٹتا ہے
کہ خسروؤں میں پڑی ہے پکار ہم بھی ہیں

تمہاری ایک نگاہ کرم میں سب کچھ ہے
پڑے ہوئے تو سر رہگذار ہم بھی ہیں

حسنؔ ہے جنکی سخاوت کی دھوم عالم میں
انھیں کے تم بھی ہو اک ریزہ خوار ہم بھی ہیں

— (۴) —

عجب کرم شہ والا تبار کرتے ہیں
کہ نا امیدوں کو امیدوار کرتے ہیں

جو خوش نصیب یہاں خاک در پہ بیٹھے ہیں
جلوس مسند شاہی سے عار کرتے ہیں

سنائے وصف رخ پاک عندلیب کو ہم
رہین آمد فصل بہار کرتے ہیں

بنائی پشت نہ کعبہ کی ان کے گھر کی طرف
جنھیں خبر ہے وہ ایسا وقار کرتے ہیں

سگانِ کوئے نبی کے نصیب پر قربان
پڑے ہوئے سرِ رہ افتخار کرتے ہیں
کشودِ عقدۂ مشکل کی کیوں میں فکر کروں
یہ کام تو مرے طیبہ کے خار کرتے ہیں
حسن کی جان ہو اس وسعت کرم پہ نثار
کہ اک جہان کو امیدوار کرتے ہیں

—(۵)—

اگر قسمت سے میں انکی گلی میں خاک ہو جاتا
غم کونین کا سارا بکھیڑا پاک ہو جاتا
لب جان بخش کی قربت حیات جاوداں دیتی
اگر ڈورا لنفس کا ریشۂ مسواک ہو جاتا
ہوا دل سوختوں کو چاہئے تھی انکے دامن کی
الٰہی صبح محشر کا گریباں چاک ہو جاتا
اگر پیوند ملبوس پیمبر کے نظر آئے
ترا اے حلۂ شاہی کلیجہ چاک ہو جاتا
کماندار نبوت قادر اندازی میں یکتا ہیں
دو عالم کیوں نہ ان کا بستہ فتراک ہو جاتا
نہ ہوتی شاق گر در کی جدائی تیرے ذرے کو
قمر اک اور بھی روشن سر افلاک ہو جاتا
حسن اہل نظر عزت سے آنکھوں میں جگہ دیتے
اگر یہ مشت خاک ان کی گلی کی خاک ہو جاتا

—(۶)—

وہ جب تشریف لائے گھر سے در تک
بھکاری کا پھرا ہے در سے گھر تک
دہائی ناخدائے بے کساں کی
کہ سیلاب الم پہنچا کمر تک
الٰہی دل کو دے وہ سوز الفت
پھنکے سینہ جلن پہنچے جگر تک
نہ ہو جب تک تمہارا نام شامل
دعائیں جا نہیں سکتیں اثر تک
خدا یوں انکی الفت میں گما دے
نہ پاؤں پھر کبھی اپنی خبر تک
نہ کھول آنکھیں نگاہِ شوقِ ناقص
بہت پردے ہیں حسن جلوہ گر تک

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ

ہز اکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ، راجہ ہری کشن بہادر کے صاحبزادے اور راجہ نریندر بہادر کے نواسے تھے ۱۲۸۱ھ میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے راجہ نریندر بہادر چونکہ لاولد تھے اس لئے شادہی کو اپنا فرزند سمجھا۔ دادا نے آپ کی تعلیم و تربیت کا عمدہ انتظام کیا اور نانا کے حسنِ توجہ سے عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیمات حاصل کیں اور دونوں زبانوں کے ماہر ہوئے مدرسۂ عالیہ میں انگریزی تعلیم حاصل کی اس کے علاوہ مرہٹی اور تلنگی زبانیں بھی سیکھیں اور خوشنویسی میں بھی مہارت حاصل کی۔ آپ کے آباؤ اجداد حیدرآباد کے نوابی دربار میں بڑے سے بڑے عہدے پر فائز و مامور تھے یہی کامیابی متعدد خوبیوں اور عمدہ کارگزاریوں کی بنیاد پر شاد کو بھی حاصل ہوئی دربار سے منسلک رہتے ہوئے ۱۲۹۱ھ میں آپ راجہ بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔ اور ۱۳۰۱ھ میں موروثی خدمت پیشکاری پر بمشاہیرہ چھ ہزار روپیہ سکۂ محبوب شاہی ممتاز ہوئے۔ محکمۂ فوج کے بھی ذمہ دار ہوئے ۱۳۱۱ھ میں بتقریب جشن سالگرہ راجہ یانِ راجہ و مہاراجہ، بہادر، ہفت ہزاری منصب، پنج ہزار سوار و علم و نقارہ و پالکی جھالر والی اور چھ عدد جواہر سے سربلند ہوئے اور نانا کی تمام جاگیروں پر بطور وارث قابض ہوئے آپ انتہائی مدبر و متفکر اور ذہین و زیرک تھے۔ ریاستی انتظام و انصرام میں ہوشیار و تجربہ کار اور مخلص ذمہ دار تھے وفاداری اور خدمت گزاری کا یہ عالم تھا کہ مالک کی اطاعت و فرمانبرداری پر کبھی آنچ نہ آنے دی تابعداری سے قدم کبھی باہر نہ نکالا اور

لمحہ لمحہ وفاداری کے چراغ کو جلائے رکھا۔ یہی سب اسباب تھے کہ ان کے عہدوں میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہی اور نواب حیدرآباد پر راجہ کا اعتماد بڑھتا گیا چنانچہ ۱۳۱۹ھ میں وقارالامراء کے سبکدوش ہونے کے بعد مہاراجہ شاد منصرم مدارالمہام مقرر کیے گئے۔ بہترین کارکردگی اور تابعداری کی بنیاد پر ۲۶ رجب ۱۳۲۰ھ میں حسب پروگرام شاہی (نواب عثمان علی خاں) مہاراجہ شاد کو عہدۂ وزارت سے سرفراز کرایا گیا اور تھوڑے عرصے کے بعد پھر یہ عہدہ مستقل کر دیا گیا اور عیدالاضحیٰ ۱۳۲۸ھ میں یمین السلطنۃ جیسے عظیم خطاب سے بھی نوازا گیا۔

مہاراجہ شاد انتہائی منکسر المزاج، خوش اخلاق، ہمدرد اور نرم مزاج انسان تھے اتنے بڑے بڑے عہدے اور خطابات کے باوجود کبھی غرور نہ کیا ایک معمولی انسان اور حاجت مند بھی ان کے دربار میں آسانی سے پہنچ سکتا تھا وہ بہت ہی فراخدل اور تعصب سے دور تھے۔ ۱۳۴۳ھ میں بمقام مقبرہ اورنگ آباد دکن میں منعقد ہونے والا عظیم الشان طرحی مشاعرہ جو ایک تاریخی و انفرادی حیثیت کا حامل ہے مہاراجہ شاد ہی کی صدارت میں ہوا تھا جس کا مصرع طرح تھا

ع اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

یہ تاریخی طرحی مشاعرہ بے پناہ اہتمام و نفاست اور بہت وسیع پیمانے پر منعقد ہوا تھا جس کی دوسری کوئی نظیر نہیں ملتی مہاراجہ شاد اس مشاعرے کے خصوصی مہمان اور صدر تھے جن کے استقبال کے لیے بڑا زبردست انتظام و اہتمام اور قصیدہ خوانی کا مظاہرہ کیا گیا اور ہزاروں شائقین نے مشاعرہ میں شرکت کی اس مشاعرے کی پوری روداد "بزم مشاعرہ" کے نام سے جناب محوی صدیقی نے ترتیب دی ہے جسے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا جن شعراء نے مہاراجہ شاد کے استقبال و اعزاز میں مدحیہ قصائد پڑھے اور طرح پر غزلیں سنائیں وہ سارے کلام "بزم مشاعرہ" میں موجود ہیں

قصیدہ پڑھنے والوں میں عبدالخالق گرامی، میر خورشید علی، مولوی سید غلام طیب، محمد حسین اور محوی صدیقی کے اسماء قابل ذکر ہیں بالخصوص گرامی اورنگ آبادی کا قصیدہ بہت خوب ہے اور ۳۲ اشعار پر مشتمل ہے جس میں مہاراجہ بہادر شاد کے علم وادب، عہدہ و اعزاز، القاب و خطابات، نرمی و ہمدردی، جذبۂ اعانت، دلداری و فراخدلی اور فکر و فن کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

مہاراجہ شاد نے علم و ادب اور شعر و سخن کی قدیمی فضاؤں میں آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے سن بلوغ کو پہنچتے ہی آپ کو شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی اور طبیعت کے رجحان و میلان اور موزونیت کے تحت اشعار کہنے لگے۔ ابتدا میں رائے بجو لعل تمکین سے اصلاح لیتے تھے استاد تمکین کے علاوہ بھی آپنے متعدد اساتذہ سے اصلاح لی مہاراجہ شاد کی شاعری ابتدائی مراحل سے گذرنے کے بعد بہت جلد پختگی و بالیدگی کی طرف گامزن ہونے لگی اور تھوڑی ہی مدت میں فنی مہارت سے قریب ہوگئی حسن لطافت اور سنجیدگی و شائستگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری صوفیانہ و عارفانہ رنگ و آہنگ سے گہری وابستگی رکھتی ہے اور یہی ان کی شاعری کا بنیادی رنگ ہے مہاراجہ کشن پرشاد شاد اسلامی تہذیب و تمدن، علم و فن اور تعلیم و تربیت سے بہت متاثر تھے اور تواریخ اسلام کے شناسا بھی تھے اس لئے ان کی شاعری میں اسلامیات کا رنگ غالب ہے اخلاق و آداب کی روشنی میں ان کا پورا شعری سرمایہ چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔

مہاراجہ شاد فارسی شعر و ادب کے بھی زبردست ماہر تھے انھوں نے زبان فارسی میں بھرپور شاعری کی اور ایک قیمتی مطبوعہ دیوان یادگار چھوڑا اردو دیوان کا نام "بیاض شاد" ہے جسے نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا۔ بیاض کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کی گئی ہے دوسرا اہتمام یہ کہ ہر غزل کے اوپر تاریخ و سن بھی درج ہے پہلی غزل

۱۲ جمادی الاولی ۱۳۳۶ھ کی ہے اور آخری غزل کی تاریخ شعبان ۱۳۴۲ھ ہے۔ بیاض کی ضخامت ۱۶۰ صفحات ہے اور جسمیں سیکڑوں غزلیں شامل ہیں۔ بیاض شاد میں نہ مثنوی ہے نہ مرثیہ، نہ قصیدہ اور نہ ہی قطعہ و رباعی البتہ چند غزلوں کی صورت قصیدہ جیسی ضرور ہو گئی ہے مگر انھیں قصیدے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ بیاض کے آخر میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ تقریباً ۴ غزلیں فارسی میں بھی ہیں جن سے ان کے فارسی کلام کے معیار و وقار کا اندازہ لگتا ہے شاد کی شاعری مخصوص نظریات و تصورات کی ترجمان ہے بیاض شاد میں رومانی و مجازی غزلوں کی تعداد بہت کم ہے کہ ایسی شاعری سے انھیں کوئی خاص لگاؤ نہیں رہا پورا بیاض صوفیانہ و عارفانہ اور نعتیہ شاعری کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے بالخصوص حمدیہ و نعتیہ اشعار کی کثرت ہے یہ تواتر اور تسلسل ان کے پورے بیاض میں ہے حمدیہ اشعار کی کثرت اس طور پر بھی قابل قدر ہے کہ بیسیوں غزلیں حمدیہ غزلوں میں تبدیل ہو گئیں یہ خصوصیت کم اور بہت کم دواوین میں دکھائی دیتی ہے خدا کی بزرگی و کبریائی اور اپنی بندگی کے ذکر کو انہوں نے اپنی شاعری کے لئے دولت سمجھا اور اس ذکر کو ہر جگہ مقدم رکھا۔ حمد میں چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

تو ہی واحد تو ہی قادر ہے قدیر مطلق
بلبلیں پڑھتی ہیں وحدت کا گلستاں میں سبق
ہے دعا شاد کی یا رب کہ بوقت آخر
نظر آئے اسے تیرا ہی نور مطلق

سر محشر یہ مجھے کہتی ہے رحمت اس کی
نام لکھوا لے تو اپنا بھی گنہگاروں میں

رو نمائی اسے ہر چند کہ منظور نہیں
رگ گردن سے وہ کچھ بھی تو مگر دور نہیں

جب دکھائی دیتا ہے نورِ خدا مجھے
خواہش بقا کی ہے نہ ہے فکرِ فنا مجھے
دیتا ہے ہم کو شاد سبھی کچھ وہ بے طلب
قربان کیوں نہ جائیں گے ایسے خدا کے ہم
خاک کا پتلا بنایا ہے مجھے اللہ نے
خاکساری کیوں نہ شیوہ ہو کہ ہیں ہوں خاکسار

آپ اپنے آپ کو جو پہچانے یہی ہے معرفت
ذرہ ذرہ میں ابھی ہو اُس کا جلوہ آشکار

اسی کے ساتھ ساتھ بیاضِ شاد میں کثیر نعتیہ اشعار اور چند نعتیہ غزلیں لکھی ہیں جو شاعر کی عقیدت و محبت کی بے پناہ جولانیت کو واضح کرتی ہیں۔ شاعر نے جس طور پر اپنے مالک حقیقی سے محبت کرنے کا اظہار کیا ہے اس طرح اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بارگاہ میں بھی نذرانۂ خلوص و عقیدت پیش کرنے کا حوصلہ دکھایا ہے مہاراجہ شاد کی نعتیہ شاعری ایک مرکزی حیثیت کی حامل ہے اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے سنجیدہ جذبات و تخیلات اور احساس و افکار کا اظہار نہ صرف بیاض شاد میں کیا ہے بلکہ خراج عقیدت کے طور پر "حمکدۂ رحمت" کے نام سے باقاعدہ نعتیہ مجموعہ تک پیش کر دیا ہے جو ان کی شاعری کے والہانہ پن اور خصوصی رجحان و میلان کا ایک قیمتی تحفہ ہے۔ مہاراجہ شاد اگرچہ ایک ہندو شاعر تھے مگر عقیدت کا عالم دیکھئے۔

ساز گار اپنا زمانہ ہو گیا
ہند سے طیبہ کو جانا ہو گیا
دفن یثرب میں ہوا لاشہ مرا
اب مسافر کا ٹھکانا ہو گیا
بت پرستی اب کہاں باقی رہی
اس کو چھوڑے اک زمانہ ہو گیا
کفر چھوڑا ای کے مے توحید کی
رنگ شاد اب عاشقانہ ہو گیا

یا محمد کی ہم اس در پہ صدا دیتے ہیں
حاضری اپنی انہیں روز لگا دیتے ہیں

نعت گوئی کا شرف ہم کو خدا نے بخشا　　جس کو کہتے ہیں مدینہ وہ ہے کشور اپنا

یا نبی صلِ علیٰ صلِ علیٰ صلِ علیٰ
ورد میرا ہے یہی آٹھوں پہر یا مصطفےٰ

شاد کی نعتیہ شاعری میں نہ کسی طرح کی کوئی ہچکچاہٹ، تکلف اور نہ ہی کسی بندش کا احساس ہوتا ہے جس طرح ایک مسلم شاعر اپنے عقیدہ و محبت کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی والہانہ پن کی رفتار شاد کی شاعری میں ملتی ہے اور ایک غیر مسلم شاعر کا اپنی شاعری کو ایک مسلم شاعر کی نعتیہ شاعری سے ہم آہنگ کر دینا واقعی بڑی بات ہے۔

یہی کہتے ہیں مدح خوان محمد　　جو شانِ خدا ہے وہ شانِ محمد

شفاعت تری شاد کیوں کر نہ ہوگی　　کہ دل سے ہے تو مدح خوان محمد

شاد کی نعتیہ شاعری جذبۂ عقیدت اور حسن لطافت سے وابستہ ہے زبان و بیان معیاری اور باوزن ہے جسمیں لچک، لطافت، نزاکت اور سادگی و روانی ہے تصورات میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے اور عقیدت و محبت میں رکھ رکھاؤ ہے یوں تو نعت کے ہندو شعرائے متقدمین کی تعداد بے شمار ہے جن میں چند نعت گو شعراء کی شعری و فکری حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے مگر اس کے باوجود ہندو شعراء کی صف میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی شعری حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے ایک ہندو شاعر اپنے نعتیہ جذبات و احساسات کو اتنے خوبصورت اور دلکش پیرایہ میں پیش کر سکتا ہے یقیناً مسرت کی بات ہے حیرت ان شعراء پر ہوتی ہے جو اللہ کے رسول کا دم بھرنے کے باوجود ایسے جذبات و افکار کے اظہار سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مہاراجہ شاد کی شاعری کا

ناصحانہ انداز بھی اہمیت کا حامل ہے وہ اتحاد و اتفاق کے زبردست حامی تھے ان کے پیغامات کی سنجیدگی اور ہمدردی ملاحظہ کیجیے ۔

عشق منظور ہے گر سوزِ جگر پیدا کر — دیکھنا ہے جو اسے پہلے نظر پیدا کر
عشق کہتے ہیں جسے کھیل نہیں لڑکوں کا — سوزِ پنہاں سے ابھی دل میں اثر پیدا کر

حسد چھوڑ و تعصب کو مٹاؤ بغض جانے دو
کرو تم صاف اپنا دل، حساب دوستاں در دل
کرو ایفا ذرا وعدہ شکایت کیا ہے شکوہ کیا
کہ تم سے ہوگی حل مشکل حساب دوستاں در دل
نہ ہو غافل رہو ہشیار اس کی راہ میں ہر دم
یہی ہے سخت اک منزل حساب دوستاں در دل

۱۔ بزم مشاعرہ، مرتبہ محوی صدیقی مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۲۸ء

۲۔ بیاض شاد مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔

۳۔ تذکرہ شعرائے دکن حصہ اول، از محمد عبد الجبار خاں مطبوعہ رحمانی پریس حیدرآباد ۱۳۲۹ھ ۔

نمونۂ کلام

کانِ عرب سے لعل نکل کر سرتاج بنا سرداروں کا
نام محمد اپنا رکھا سلطان بنا سرداروں کا

باندھ کے سر پر سبز عمامہ کاندھے رکھ کر کالی کملی
ساری خدائی اپنی کر لی مختار بنا مختاروں کا

تیرا چرچا گھر گھر ہے جلوہ دل کے اندر ہے
ذکر ترا لب پر جاری دلدار بنا دلداروں کا

روپ ہے تیرا رتی رتی نور ہے تیرا پتی پتی
مہر و مہ کو تجھ سے رونق نور بنا سیاروں کا

تیرے عرق میں گل کی بو قامت تیرا سرو چمن
بس گئیں کلیاں طیبہ کی بھاگ کھلا گلزاروں کا

امی گو سب کہتے تھے علم لدنی کا تھا علم
راز بھرا تھا سینے میں قرآن کے تیسوں پاروں کا

بوبکر و عمر عثمان و علی تھے چار عناصر ملت کے
کثرت وحدت میں ہے جیسے حال وہ تھا ان چاروں کا

کسب تجلی کرتے تھے چاروں ایک ہی مہر نبوت سے
بخت رسا تھا برج شرف میں تیرے چاروں یاروں کا

بادۂ عرفاں دیتا ہے ساقی وحدت کے میخانے سے
شادؔ مقدر فضل خدا سے جاگا اب میخواروں کا

— (۲) —

بلوائیں مجھے شاد جو سلطان مدینہ
جاتے ہی میں ہو جاؤں گا قربانِ مدینہ

وہ گھر ہے خدا کا تو یہ محبوب خدا ہیں
کعبے سے بھی اعلیٰ نہ ہو کیوں شانِ مدینہ

روکیں گے نہ دربار میں جانے کیلئے شاد
پہچانتے ہیں سب مجھے دربان مدینہ

لے جاؤں گا میں ساتھ فقط عشق محمد
تحفہ ہے مرے پاس یہ شایان مدینہ

کھولے در جنت کو یہی کہتا ہے رضواں
بے خوف چلے جائیں غلامان مدینہ

نشہ ہے وہ ان کو جو اترتا ہی نہیں ہے
توحید کی مے پیتے ہیں مستانِ مدینہ

اللہ دکھا دے تو مجھے روضۂ اقدس
باقی کہیں رہ جائے نہ ارمانِ مدینہ

کیوں میری شفاعت میں بھلا دیر لگے گی
کیا مجھ کو نہیں جانتے سلطانِ مدینہ

مومن جو نہیں ہوں تو میں کافر بھی نہیں ہوں
اس رمز سے آگاہ ہیں سلطان مدینہ

—: (۳) :—

عرش عظیم پر کہ تہہ آسماں نہ تھا
یا رب ترے حبیب کا جلوہ کہاں نہ تھا

معراج میں حضور ہوئے جبکہ باریاب
بس آپ تھے اکیلے کوئی اور واں نہ تھا

احمد کے در پہ اس لئے میں جبہ سا رہا
سجدے کے لائق اور کوئی آستاں نہ تھا

معراج میں حضور جو مدعو خدا کے تھے
خلوت تھی کوئی اور وہاں میہماں نہ تھا

حضرت کے دم قدم سے یہ رونق بڑھی ہے سب
اسلام کا جہان میں پہلے نشاں نہ تھا

— (۴) —

سازگار اپنا زمانہ ہو گیا
ہند سے طیبہ کو جانا ہو گیا

دفن یثرب میں ہوا لاشہ مرا
اب مسافر کا ٹھکانا ہو گیا

بت پرستی اب کہاں باقی رہی — اسکو چھوڑے اک زمانہ ہوگیا
کفر چھوڑا پی کے مے توحید کی — رنگ شاداب عاشقانہ ہوگیا

(۵)

کیا کرے لیکے جو ہو عاشق حضرت جنت — واعظا تیرے لئے ہے یہ غنیمت جنت
کیا کریں لیکے مکاں گر نہ ملے ہم کو مکیں — کہ نہیں طالب مولیٰ کو یہ دولت جنت
جس کو حاصل ہو مدینے کی زیارت اے دل — اسی طاعت کے عوض ہو گی عنایت جنت

بیٹھ کر شاد کرو گوشے میں اللہ اللہ
مل ہی جائے گی تمہیں روز قیامت جنت

(۶)

مرے والی مرے مولیٰ مرے سلطان عرب — مرے محبوب خدا پیارے نبی جان عرب
لاکھوں مبعوث پیمبر ہوئے اس عالم میں — کون حضرت سا ہوا شان عجم جان عرب
بلغا مان گئے سارے بلاغت کو تری — اور قائل ہیں فصاحت سے فصیحان عرب

ہندی و رومی و مکی، مدنی سب اے شاد
جان و دل سے ہیں مطیع شہ ذیشان عرب

حوالۂ کتب و رسائل (بالترتیب)

اردو کی نعتیہ شاعری — فرمان فتحپوری — مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء

المجموعۃ النبہانیہ — علامہ یوسف نبہانی — مطبوعہ بیروت

برکات آل رسول ۔ علامہ یوسف نبہانی (اردو ترجمہ) مولانا اشرف قادری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۰ء

مدارج النبوہ ۔ شیخ عبدالحق محدث (اردو ترجمہ) مفتی غلام معین الدین مطبوعہ دہلی ۱۹۸۶ء

ترتیل — سید اختر چشت نظامی — مطبوعہ کراچی ۱۴۰۴ھ

حباب شہید — مولانا انتظام اللہ شہابی — مطبوعہ مرتضائی پریس آگرہ ۱۳۵۹ھ

اشرف التواریخ (حصہ دوم) شاہ اکبر داناپوری — مطبوعہ آگرہ اخبار ۱۳۲۳ھ

خمخانہ جاوید — لالہ سری رام — حصہ پنجم

ماہنامہ نگار — ایڈیٹر نیاز فتحپوری — جنوری ۱۹۳۵ء

مختصر تاریخ ادب اردو — اعجاز حسین — مطبوعہ الہ آباد ۱۹۸۴ء (جدید ایڈیشن)

اردو ادب کی تاریخ — نسیم قریشی — مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۹ء

رمز الشہادتین — غلام امام شہید — مطبوعہ کاشی پریس آگرہ ۱۹۶۹ء

مولود شہید — " — " احمدی پریس کانپور ۱۳۰۳ھ

نقوش رسول نمبر — مرتبہ محمد طفیل — " لاہور ۱۹۸۳ء

قصائد نعتیہ — غلام امام شہید — " نظامی پریس کانپور ۱۲۹۲ھ

جنرل، خدابخش خاں لائبریری اشترکہ شمارہ ۱۳ - ۱۴ - ۱۵ - ۱۶ - مطبوعہ پٹنہ ۱۹۸۰ء

گل رعنا — سید عبدالحی — مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۴۰ھ

انشائے بہار بے خزاں — غلام امام شہید — مطبوعہ کاشی پریس آگرہ ۱۸۶۶ء

دیوان شہیدی — کرامت علی شہیدی — " نامی پریس لکھنؤ ۱۸۹۴ء

گلدستۂ عطار — حصہ دوم — " آگرہ ۱۹۰۹ء

۱۸۷۵ء کی جنگ آزادی اور علماء حق ۔ حمید راعی — ماہنامہ اشرفیہ فروری ۱۹۸۲ء

۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء	امداد صابری	مطبوعہ دہلی ۱۹۵۹ء
الملفوظ حصۂ دوم	شاہ احمد رضا	مطبوعہ کراچی
مولد شریف بہاریہ	کافی مراد آبادی	مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۲۷۳ھ
تذکرہ نعت گویان بریلی	لطیف حسین ادیب	مطبوعہ بریلی ۱۹۸۶ء
دیوان لطفؔ	لطف علی لطف	" احمدی پریس لکھنؤ ۱۳۰۱ھ
نقوش (حصۂ دہم) رسول نمبر	محمد طفیل	" لاہور ۱۹۸۶ء
کلیات محسنؔ	مرتبہ نور الحسن	" لکھنؤ ۱۹۸۲ء
لکھنؤ کا دبستان شاعری	ابو اللیث صدیقی	" مٹیا محل دہلی ۱۹۶۵ء
ماہنامہ المیزان بمبئی	امام احمد رضا نمبر	" بمبئی ۱۹۷۶ء
شاہ احمد رضا اور مرزا غالبؔ	سید شمیم گوہرؔ	ماہنامہ قاری دہلی جون ۱۹۸۹ء
حدائق بخشش (اول و دوم)	شاہ احمد رضا بریلوی	مطبوعہ بریلی ۱۳۲۵ھ
مقالات یوم رضا	احمد عابد علی	مطبوعہ لاہور اپریل ۱۹۷۱ء
شعر محسنؔ	نظیر لدھیانوی	" لاہور ۱۹۷۸ء
ماہنامہ فاران کراچی	ایڈیٹر ماہر القادری	شمارہ ستمبر ۱۹۷۳ء
تذکرۂ علمائے اہل سنت	محمود احمد قادری	مطبوعہ کانپور ۱۳۹۱ھ
ذوق نعت	حسنؔ بریلوی	" بریلی ۱۳۲۶ھ
قبالۂ بخشش	جمیل بریلوی	" بریلی ۱۳۴۱ھ
بزم مشاعرہ	مرتبہ محوی صدیقی	مطبوعہ اورنگ آباد دکن ۱۹۲۸ء
بیاض شادؔ	کشن پرشاد شادؔ	" نظامی پریس بدایوں
تذکرۂ شعرائے دکن (حصہ اول)	عبد الجبار خاں	" رحمانی پریس حیدرآباد ۱۳۲۹ھ
خمکدۂ رحمت	کشن پرشاد شاد	" حیدرآباد